نئے غلام

کرشن چندر

425

نئے غلام

کرشن چندر

قیمت [redacted]

قادری کتب خانہ، بمبئی ۳

(جملہ حقوق محفوظ ہیں)

باراوّل

اپریل ۱۹۵۳ء

قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے

اے کے قادری نے قادری پریس نور منزل محمد علی روڈ بمبئی ۳ سے چھپوا کر قادری کتبخانہ سے شـ

نئے غلام

کوریا کی لڑائی میں مرنے والے امریکی سپاہی کے

نام ایک خط

فہرست

نئے غلام
پہلا اور تیسرا
سڑک کے کنارے
اخباری جوتشی
صاحب
موریتیاں
سیٹھ جی
کشمیر کو سلام
مہالکشمی کا پُل
مچھلی جال

یہ خط میں نے سپاہی کینتھ شیڈرک، عمر بیس سال، ساکن مغربی ورجینیا، امریکہ کے نام لکھا ہے۔ سپاہی کینتھ شیڈرک پہلا امریکی سپاہی ہے جو کوریا کے محاذ پر کوریائیوں کے خلاف لڑتا ہوا مارا گیا۔ اس سپاہی کو امریکہ کے صدر ٹرومین نے وہاں بھیجا تھا۔

میں نے اس کے مرنے کی خبر کل شام کے اخبار فری پریس بلیٹن میں پڑھی تھی۔ جنرل میک آرتھر کے فوجی ہیڈ کوارٹر نے بڑے طمطراق سے اس کی موت کی خبر شائع کی تھی۔ لیکن اس خبر میں افسوس کا شائبہ تک نہ تھا۔ مرنے والے کے اعزا سے ہمدردی کا کوئی پہلو نہیں نکلتا تھا۔ مرنے والے کی زندگی اس کی عادتوں اور طور طریقوں پر کوئی روشنی نہیں پڑتی تھی۔ یہ بھی نہیں پتہ چلتا تھا کہ اس کی شکل و صورت کیسی تھی۔ کیونکہ اس خبر کے ساتھ جو تصویر شائع کی گئی تھی وہ امریکی جنرل میک آرتھر کی تھی۔ تصویر جنرل میک آرتھر کی تھی۔ موت سپاہی کینتھ شیڈرک کی۔

جوں ہی میں نے اس کے مرنے کی خبر پڑھی، میں نے اُسے خط لکھنے کا فیصلہ کیا یہ تو میں جانتا تھا کہ مُردے میرا خط نہیں پڑھ سکتے۔ لیکن اتنی ضرور امید ہے کہ اگر کوئی دوسرا سپاہی اس خط کو پڑھے گا تو اسے پڑھ کر مرنے والے کی فوجی وردی کے بائیں طرف کی اندرونی

جیب میں ڈال دیگا جہاں سپاہی شیڈرک نے اپنی سونے کی گھڑی رکھی ہوئی ہے جہاں اسکی محبوبہ کی ہنستی ہوئی تصویر ہے۔ جہاں اس کی ماں کا آخری خط ہے اور پھر جب جنرل سیک آرتھر کے ملازم متوفی کی آخری چیزیں اس کے وارثین کو واپس کریں گے۔ مجھے اُمید ہے کہ یہ خط بھی کسی نہ کسی طرح ان چیزوں کے ہمراہ مغربی ورجی نیا پہنچ جائے گا اور وہاں اسے سپاہی شیڈرک کے رشتے دار پڑھیں گے، اس کے دوست اور دوسرے ہزاروں نوجوان شیڈرک جن کی عمر ۲۰ سال کی ہے۔ جو مغربی ورجی نیا کے رہنے والے ہیں اور جنہیں اس پہلے مرنے والے کی طرح سزائے موت دی گئی ہے۔ اس لئے یہ خط اشد ضروری ہے۔ کیونکہ مردوں کو دوبارہ زندگی نہیں مل سکتی۔ لیکن زندہ تو زندہ رکھے جا سکتے ہیں۔

جس خبر میں شیڈرک کی موت کا ذکر تھا۔ اس میں بھی لکھا تھا کہ امریکی فوج کوریا والوں سے پٹ کر بڑی تیزی سے پسپا ہو گئی۔ اتنی تیزی سے کہ وہ لوگ اپنے زخمی اور مردہ سپاہیوں کی لاشیں بھی وہیں چھوڑ گئے۔ تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم ابھی تک وہیں ہو۔

سپاہی شیڈرک تم ابھی تک کوریا کے کسی اونچے ٹیلے پر مرے پڑے ہو اور میں تمہارے دل کے اندر دھنسی ہوئی کارتوس کی گولی دیکھ سکتا ہوں۔ تمہاری آنکھوں کا کرب تمہارے سنہرے بال دھوپ میں چمکتے ہوئے اور میرا دل غم اور غصے سے بھر جاتا ہے، اور میں پوچھتا ہوں کہ وہ کون تھا۔ جو تمہیں یہاں لایا۔ جس نے تم سے تمہاری جوانی، تمہاری محبوبہ، تمہاری ماں کی محبت تم سے چھین لی اور تمہیں وطن سے اتنی دور اجنبی اور انجانے ٹیلوں پر مرنے کے لئے مجبور کیا۔ وہ کون تھا۔ جس نے تمہارے ہاتھ میں بندوق دیدی اور تم سے کہا جاؤ اپنی ۲۰ سالہ جوانی کی ساری آرزوؤں اور امنگوں کو اجنبی کوریا کے میدانوں اور پہاڑوں پر لے جا کے ان کے سینے میں گولی داغ دو؟ .... وہ کون تھا؟ ..... وہ کون سی طاقتیں تھیں؟ ہمیں ان کا پتہ چلانا ہے۔ کیونکہ امن کی پیاسی دُنیا اس سوال کا جواب چاہتی ہے۔

تم بھی کہو گے عجب انسان ہے۔ جو اسقدر بے تکلف ہو کر مجھے خط لکھ رہا ہے معاف

کرنا۔ میں جلدی میں اپنا تعارف کرانا بالکل بھول گیا۔ میرا نام کرشن چندر ہے۔ کچھ عرصے پہلے میں لاہور کی ایک چھوٹی سی گلی میں رہتا تھا۔ میری گلی کا نام چوک متی تھا۔ معلوم نہیں آج کل لوگ اسے کہتے ہیں۔ کیونکہ یہ حقیقت ہے۔ شاید تمھیں اس پر اعتبار آئے یا نہ آئے کہ جن لوگوں نے تمھاری زندگی تم سے چھینی ہے۔ ان ہی لوگوں نے میرا وطن، میرا شہر، میری گلی مجھ سے چھین لی ہے۔ اور جس طرح تم آج اپنے گھر واپس نہیں جا سکتے میں بھی اپنی گلی کو لوٹ نہیں سکتا .... کہ یہ سب محض ایک اتفاق ہے۔ ایک جابر اتفاق، ایک ظالم قسمت جس نے تم سے اور مجھ سے یہ سلوک کیا یا کہ ایک خوفناک ظالمانہ سازش ہے چند سیاست دانوں کی اور ظلم پر دردہ قوتوں کی جنہوں نے تم سے تمہاری زندگی اور مجھ سے میرا وطن چھینا ہے۔ تمہیں اور مجھے دونوں کو مل کر اس سوال کا جواب تلاش کرنا ہے۔ ماضی اور حال کو ملا کے مستقبل کا راستہ ڈھونڈنا ہے

یہ سچ ہے کہ میں تمھارے امریکہ کبھی نہیں گیا ہوں مجھے کبھی پاس پورٹ ہی نہیں ملا۔ نہ انگریزی سرکار نے دیا۔ نہ کانگریسی سرکار نے۔ اس پر بھی میں تمھارے امریکہ کو اچھی طرح جانتا ہوں اس کے خدوخال کی تمامتر رعنائی اور اس کی اندرونی بدصورتی بھی مجھ پر آشکارا ہے امریکہ کا چہرہ میں نے پہلے پہل ایک چھوٹی سی کہانی میں دیکھا۔ اپنی انگریزی کی پہلی کتاب میں یہ امریکہ کے پہلے صدر جارج واشنگٹن کی کہانی تھی۔ کس طرح وہ ہمیشہ سچ بولتا تھا اور سچ پر عمل کرتا تھا۔ اس کہانی نے مجھے اپنے بچپن میں بہت متاثر کیا اور میں سمجھتا رہا کہ امریکہ سچ بولنے والوں کا ملک ہوگا جہاں کوئی بھی جھوٹ نہیں بولتا ہے۔ پھر میں بڑا ہوا تو میں نے مزید تعلیم حاصل کرنے کے لئے لاہور میں ایک امریکی کالج میں داخلہ لے لیا۔ فارمن کرسچن کالج لاہور میں۔ یہاں میں نے ان عظیم امریکی عوام کا چہرہ دیکھا جنہوں نے انگریزی شہنشاہیت کے خلاف آزادی کی جنگ لڑی جنہوں نے غلامی کے خلاف جنوبی امریکہ سے اپنے ہی بھائیوں سے حق و صداقت کے لئے خانہ جنگی کی اور غلام حبشیوں کو آزادی دلانے کی پوری کوشش کی اور جن کے لئے دنیا کی دوسری قوموں کے دلوں میں بڑی عزت اور محبت ہے۔ ایسے

امریکہ کو میں سر جھکا کے سلام کرتا ہوں، آزادی کا جذبہ، آزادئی تحریر و تقریر کی قدر و قیمت بھی مجھے اپنے امریکی پروفیسروں سے ملی ہے۔ جمہوریت پر بھروسہ کرنا میں نے ان ہی سے سیکھا۔ میں نے ابراہام لنکن کو دیکھا۔ امریکہ کے ساحل پر ایستادہ آزادی کی دیوی کو دیکھا اور ان نڈر آزاد مزاجی بہادروں کے کارنامے پڑھے۔ جنہوں نے امریکہ کے قبائلی منظر کو ایک جاندار شاندار پھیلتے ہوئے جیتے جاگتے وسیع تمدن میں تبدیل کر دیا۔ وہاں پر میں نے مارک ٹوین، ڈریزر، اور والٹ وٹمین کو پڑھا۔ جس نے اپنی نظموں میں مجھ سے اس طرح گفتگو کی، جیسے وہ میرا ہمسایہ ہو اور ساتھ والے گھر میں رہتا ہو۔ اور پھر ایک روز تاریخ کے پروفیسر نے مجھے ایک گراموفون ریکارڈ تحفے میں دیا یہ پال روبسن کا گیت تھا اور مجھے اس کے نغمے میں تخلیق کا سارا درد اور اس کی ساری خوشی مستور نظر آئی اور میری نگاہوں میں امریکی وادیوں میں ڈیفوڈل کے پیلے پیلے لاکھوں پھول کھلتے گئے۔ اور لاکھوں بازو اپنی صاف ستھری دیانت دار انگلیوں سے امریکہ کے کارخانے چلانے لگے، میں نے ہزاروں بچوں کی ہنسی سنی جو بستے بغل میں دبائے اسکولوں سے واپس آرہے تھے اور اس ہنسی کے ساتھ میں نے ان سینکڑوں ندیوں کی ہنسی سنی جو دائی کے گھنے جنگلوں میں سب کی نظروں سے دوپریوں کی طرح محو خرام رہتی ہیں۔ حیرت ہے کہ پال روبسن کا ایک نغمہ اپنی پہنائی میں کیا کچھ سمیٹ لاتا ہے۔ امریکہ کا لامحدود حسن اور اس کا سُندر سجیل روپ ——— میں پال روبسن کا اور اپنے دوسرے امریکی دوستوں کا شکر گزار ہوں۔ ان کی مدد سے میں نے اپنی ناواقفیت کی نقاب الٹ کر امریکی عوام کا خوبصورت چہرہ دیکھا ہے۔ یہ عوام تو بالکل میرے اپنے وطن کے عوام جیسے ہیں۔ بالکل اسی طرح سیدھے سادے محبت کرنے والے صاف دل لوگ جیسے میرے وطن کے لوگ ہیں۔

لیکن ایک دوسرا امریکہ بھی ہے۔ عوام کا امریکہ نہیں۔ عوام کا حق غصب کر کے ان پر حکومت کرنے والوں اور فوجی رہنماؤں اور بڑے بڑے تاجروں کا امریکہ۔ امریکہ جو فورڈ کا ہے۔

ڈلر کا ہے۔ ڈوبان کا ہے، راک فیلر اور مورگان کا ہے اور دوسرے سینکڑوں ایسے تاجروں اور بینکروں کا ہے جن کا نام بھی میں نہیں جانتا۔ لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں کہ یہی وہ امریکہ ہے جس نے تمہیں کوریا میں موت کے گھاٹ سلایا ہے اور جن کا ہاتھ اگر کبھی مجھ پر پڑ جائے تو مجھے بھی موت کے گھاٹ اتار دینے میں کوئی کسر نہ چھوڑیں گے۔ یہ عظیم تجار، سونے، چاندی، لوہا، کوئلہ، آلو، تیل، زہریلی ڈاؤں اور اسلحہ جات کی سامراجی کوٹھیوں کے مالک یہی وہ لوگ ہیں جو ہر جاندار یا غیر جاندار شے کو شخصی منافع کے لئے بیچتے ہیں۔ جنہوں نے تمہیں بھی ایک گھوڑے سے منافع کے لئے کوریا میں بیچ دیا ہے۔ شاید تمہارے ہاتھ میں بندوق دیتے وقت انہوں نے تمہیں راز نہیں بتایا ہوگا کہ تم سے صرف یہ کہا ہوگا کہ تم امریکی قوم کے حقوق کی حفاظت کرنے کوریا جا رہے ہو۔ تمہیں اس وقت ان رہنماؤں سے پوچھنا چاہیئے تھا کہ وہ کون سے امریکی حقوق ہیں اور وہ کوریا میں کیا کر رہے ہیں کیوں ان حقوق کو واپس امریکہ میں مغربی ورجی نیا میں نہیں بلا لیا جاتا جہاں میں وطنیت کے ایک صحیح اور جامع جذبے سے سرشار ہو کے ان کی حفاظت کر سکتا ہوں؟ شیڈرک تم نے بڑی سخت غلطی کی جو تم نے اپنے رہنماؤں سے یہ سوال نہیں پوچھا۔ تم نے اس کی بڑی سخت سزا بھگتی ہے میں جانتا ہوں کہ تم اس کے لئے اکیلے زیادہ گناہ گار نہیں ہو۔ میں تمہیں الزام نہیں دیتا۔ کیونکہ میں جانتا ہوں کہ یہ امریکی سامراجی تاجر کتنے پُرفن اور چالاک ہوتے ہیں جاپان سے جنگ چھڑنے سے ایک روز قبل پرل ہاربر کے دن تک یہ تاجر جاپان کو لوہا بیچ رہے تھے دو سینٹ کے منافع کے لئے انہوں نے اپنے ملک کو بیچ ڈالا اور تمہیں تو شاید انہوں نے دو سینٹ کے منافع کے قابل بھی نہیں سمجھا اور ابھی تمہاری طرح ہزاروں امریکی شیڈرک گولیوں کا نشانہ بنیں گے۔ اور پھر جا کے کہیں انھیں سمجھ آئے گی کہ اب تک وہ جس چیز کے لئے لڑتے رہے وہ امریکی جمہوریت نہیں تھی۔ وہ کوئلے کا ایک ٹکڑا تھا۔ جس پر کوریا والوں کا حق تھا۔ وہ مٹی کے تیل کا ایک قطرہ تھا جس پر فلسطین کا حق تھا، وہ ربڑ کا ایک

درخت تھا۔ قلعی کی ایک کان تھی جس پر ملایا والوں اور ہند چینی والوں کا حق تھا۔ تم جمہوریت پھیلانے نہیں آئے تھے۔ دوسروں کا حق غصب کرنے آئے تھے" یہ تمہاری غلطی تھی کہ تم نے اپنے رہنماؤں سے اس بارے میں کچھ نہیں پوچھا۔ میں سمجھتا رہا کہ انسان دنیا میں بہت سے کام یوں ہی کرتا ہے۔ عدم توجہی سے کرتا ہے۔ لیکن میں یہ بھی سمجھتا ہوں کہ جب ایک آدمی اپنے ہاتھ میں بندوق اٹھاتا ہے اور دوسرے کے گھر میں گھستا ہے تو اسے اپنے آپ سے بہت سے سوال کرنے چاہئیں۔ کیا یہی راستہ ہے؟ اس کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں۔ کیا میں راستی پر ہوں۔ کیا ایک دوسرے کے گھر میں گھسنے کا مجھے کوئی حق ہے؟ یہ سوال بندوق اٹھانے سے قبل ضرور طے کر لینے چاہئیں۔ کیونکہ بندوق زندگی کیتی ہے، دیتی نہیں اور ہمارے ایشیا میں تو ایک بہت ہی خوبصورت دستور ہے۔ ہم لوگ اگر مانگنے کے لئے کسی کے گھر جاتے ہیں تو بندوق نہیں لے جاتے، پھول لے جاتے ہیں اور میں نے سنا ہے کہ تمہارے مغربی دنیا میں بڑے ہی خوبصورت پھول ہوتے ہیں۔ میرے دوست! تم ایشیا میں پھول نہیں لائے بندوق لائے اس لئے امریکی ایشیائی تعلقات کی کہانی اس قدر اداس اور دردناک کہانی بن گئی۔ یہ کہانی آج سے بہت عرصہ پہلے شروع ہوئی تھی ۱۸۵۳ء میں امریکی کموڈور پیری اپنے چھوٹے سے بحری بیڑے کی کمان میں جاپان کے ساحلوں پر نمودار ہوا اور بندوق اٹھا کے کہنے لگا۔ اپنے ملک کے سارے دروازے کھول دو اور امریکی تجارت کو اندر آنے دو۔ ذرا یاد کرو کہ ۱۹۵۳ء میں پیری جاپان میں نمودار ہوا اور ۱۸۵۹ء میں نکلسن دلی کا دروازہ کھٹکھٹا رہا تھا۔ اور باسفورس سے ہانگ کانگ تک اور اس سے اور آگے تک ہمارے ایشیائی ملکوں میں برطانوی پرتگیزی، فرانسیسی اور ولندیزی سامراجیوں کی لوٹ مچی ہوئی تھی۔ یہ لوگ جو دراصل منافع اور لوٹ کھسوٹ کے لئے ایشیا آئے تھے اور دنیا کو یہ کہہ کر ٹھگتے تھے کہ وہ جاہل اور وحشی ایشیا میں عیسائی تہذیب و تمدن کا رواج دینا چاہتے ہیں آج جبکہ ایشیا کے

ہر ملک میں محب وطن اپنی آزادی کے لئے جان کی بازی لگا رہے ہیں، سامراجیوں نے وہ نعرہ ترک کر دیا ہے۔ آج ان کا نعرہ ہے ہم اشتراکیت کو کمیونزم کو ایشیا میں نہیں آنے دیں گے۔ ہم اپنی جمہوریت پھیلائیں گے۔ آج نعرہ بدل گیا ہے نعرے باز نہیں بدلے یہ وہی موت کے سوداگر ہیں بھیس بدل کر آئے ہیں۔ لیکن میں ان کا چہرہ اس نقاب کے اندر بھی صاف صاف دیکھ سکتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ تم بھی اسے دیکھو اور تمہاری طرح دوسرے لاکھوں امریکی نوجوان بھی دیکھیں جنہیں جنگ کا ایندھن بنایا جا رہا ہے۔ یہ اس دوسرے امریکہ کا چہرہ ہے جو اپنی ڈالری شہنشاہیت پر سخاوت اور خیرات کی نقاب اوڑھے ہوئے ہے۔ اس نقاب کو الٹ دو، دوست۔ اس سے اس کا خاتمہ قریب آ جائے گا۔

میں تمہیں امریکی اور مغربی سامراجیوں کی کہانی سنا رہا تھا ۱۸۸۸ء میں چین میں محب الوطنوں نے باگسر کی بغاوت اٹھائی۔ لیکن مغربی سامراجیوں نے مل جل کر اس بغاوت کو بڑی سختی سے کچل دیا۔ اور اس پانچ ہزار سال پرانے مہذب ملک کے دروازے پھر اس اجنبی ڈاکو کے لئے وا کر دئے گئے، جو اندر آ کے چینی عوام کی محنت لوٹنا چاہتا تھا اس کے دریاؤں پر قبضہ جمانا چاہتا تھا۔ اس کی کانوں کی دولت اور قیمتی پیداوار سے چینی عوام کو محروم رکھنا چاہتا تھا اور ان کی وطنی عزت اور حرمت کو پاؤں تلے روند دینا چاہتا تھا۔ چنانچہ یہ سب کچھ ہوا اور پہلی جنگ عظیم لڑی گئی اور پھر دوسری جنگ عظیم۔ جس کے آخر میں بظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سارا چین اور سارا جاپان امریکی سامراجی اقتدار تلے آ گیا ہے اور پھر کوریا بھی۔ کوریا کے بیچ میں اڑتیسویں عرض البلد کے نیچے سارے علاقہ پر امریکی ڈالر نے اپنے پاؤں جما لئے اور اس طرح کوریا کا یہ خوب صورت ملک بھی ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ جس کا تہذیبی سلسلہ کم از چار ہزار برس پرانا ہے۔ اگر میں تم سے کہوں کہ یہ انسانیت کے خلاف اک جرم ہے تو شاید بے جا نہ ہوگا۔ کیونکہ آج تک کسی قوم کا دل اس طرح طول البلد اور عرض البلد کی لکیروں سے ناپا نہیں گیا ہے کوریا ایک لمبے عرصہ سے ایک ملک ہے، ایک

قوم ہے ایک زبان ہے، ایک گیت ہے اور مغربی اور امریکی سامراجیوں کی تمام تر سازشوں اور جنگوں کے بعد بھی ایک رہے گا۔ ایسا میرا اعتقاد ہے کہ آج کسی بھی اجنبی طاقت یا قوت کو یہ حق ہی نہیں کہ وہ ایک قوم کے دو ٹکڑے کر دے اور جو ایسا کرتا ہے ہم اسے جمہوریت پسند نہیں کہتے، اسے جمہوریت دشمن کہتے ہیں۔

کوریا پر کوریا والوں کا حق ہے۔ جس طرح امریکہ پر امریکہ والوں کا حق ہے۔ وہ جس طرح چاہیں اس کی قسمت جگائیں بگاڑیں۔ جس طرح کی حکومت چاہیں بنائیں، اپنے رہنما چنیں اپنا معاشی اور سیاسی نظام بدلیں اور انھیں اس بات کا پورا پورا اختیار رہے کہ ان کی اندرونی اور خارجی پالیسی کیا ہوگی۔ ان کے جھنڈے کا کیا رنگ ہوگا اور ان تمام باتوں پر ان کا حق فائق ہے۔ اور کسی اجنبی کو یہ حق نہیں ہے کہ ان کے متعلق اپنا فیصلہ ان پر ٹھونس دے اگر کوریا کے لوگ آپس میں مل بیٹھ کر صلح صفائی سے اس معاملہ کو طے کر لیتے ہیں تو بہت ہی اچھا ہے۔ لیکن اگر وہ اس معاملہ کو اپنی ذاتی نجی خانہ جنگی سے طے کرتے ہیں تو بھی کسی دوسرے کو اس میں بولنے کا حق نہیں ہے۔ وہ صلاح دے سکتا ہے اس خانہ جنگی کو اچھا یا برا کہہ سکتا ہے۔ لیکن بندوق اٹھا کے ان کے گھر میں نہیں گھس سکتا۔ آخر امریکہ میں بھی تو خانہ جنگی ہوئی تھی اور شمالی امریکہ والوں نے جنوبی امریکہ والوں سے غلامی کے خلاف خانہ جنگی کی تھی اور کئی سالوں تک۔ لیکن بیچارے کوریا والوں نے تو اس خانہ جنگی میں کوئی مداخلت نہیں کی اور برطانیہ کی خانہ جنگی بھی ہمیں یاد ہے۔ جب انہوں نے اپنے بادشاہ چارلس اوّل کا سر قلم کر دیا تھا۔ اُس وقت بھی شاہ کوریا نے برطانیہ کی شاہیت کی حمایت کرنے کے لئے اپنے سپاہی برطانیہ میں نہیں بھیجے تھے تو پھر آج کیوں برطانیہ کوریا کے سمندر میں اپنا بحری بیڑا بھیج رہا ہے۔ کس لئے؟ کیا اڑتیسویں عرض البلد کی حفاظت کے لئے؟ یہ بھی عجیب مذاق ہے۔ کوئی تعجب نہیں کہ اگر واقعات کی یہی رفتار رہی اور امریکی سامراجی کوریا سے اسی طرح بھاگتے رہے تو ایک روز برطانیہ کو خط استوا کی حفاظت کرنی پڑ جائے۔

لیکن آج ایشیائی اس اڑتیسویں عرض البلد کے ڈھونگ سے اچھی طرح واقف ہو چکے ہیں۔ انھیں اچھی طرح معلوم ہے کہ امریکی سپاہی یہ لڑائی اڑتیسویں عرض البلد کو بچانے کے لئے نہیں بلکہ اس دوسرے عرض البلد کو بچانے کے لئے بھیجے جا رہے ہیں جو ایشیا کے دل کو ایک سرے سے چیرتا ہوا دوسرے سرے تک جا نکلتا ہے۔ یہ ظالم سامراجی عرض البلد جس ملک سے گزرتا ہے۔ اس کے دو ٹکڑے کر دیتا ہے۔ فلسطین سے گزرتا ہے تو فلسطین اسرائیل اور عرب میں منقسم ہو جاتا ہے۔ ہندوستان سے گزرتا ہے تو ہندوستان، بھارت اور پاکستان میں تقسیم ہو جاتا ہے۔ برما سے گزرتا ہے تو کیرن ریاست اور ایراودی ریاست میں تقسیم ہونے لگتا ہے۔ انڈونیشیا سے گزرتا ہے تو نیوگنی انڈونیشیا سے الگ ہو جاتا ہے۔ ہند چین سے گزرتا ہے تو دیت نام کے مقابلہ پر بودائی کی کٹ پتلی حکومت ظہور میں آجاتی ہے۔ یہ عرض البلد ایشیائی قوموں کو ملاتا نہیں ہے۔ کمزور کرتا ہے تاکہ وہ بدستور محکوم رہیں اور سامراجیوں کے تسلط کے نیچے دبے رہیں مغربی سامراج پہلے تو ایشیائیوں میں سے اپنے لئے دلال اور کٹ پتلیاں ڈھونڈتا ہے انھیں اپنے مفاد کے لئے استعمال کرنے کے لئے انھیں سچے قومی رہنما بتاتا ہے اور دوسرے محب وطنوں کو "کمیونسٹ" کہہ کر عوام کو گمراہ کرنے کی کوشش کرتا ہے اور پھر ان نام نہاد سچے قومی رہنماؤں کی چھتر چھایا میں اپنی سامراجی لوٹ کھسوٹ جاری رکھتا ہے جنگ سے پہلے اور جنگ کے بعد بھی یہی ہوتا رہا۔ لیکن جنگ کے بعد جب پورے ایشیا میں قومی تحریکیں زور سے ابھریں تو سامراج نے زیر زمین پناہ لی اور اپنے دیسی ایجنٹوں اور دلالوں کے لوپر اچھال دیا۔ لیکن جب ان سے بھی کام نہ بنا تو خود بندوق لے کر کوریا میں کھڑا ہو گیا۔ یہ سامراج کی آخری لڑائی ہے۔ دوست! اسی لئے یہ بندوق کی گولی آج تمہارے سینے کے پار ہوئی ہے۔

میں چاہتا ہوں کہ تم اس معاملے کو اچھی طرح سمجھ لو اور تمہاری طرح دوسرے ہزاروں

لاکھوں امریکی نوجوان بھی اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لیں کیونکہ ان کی اس سوجھ بوجھ پر دنیا کے امن کا دارومدار ہے آج امریکی عوام اور امریکی نوجوانوں پر ایک بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ اور میں امید کرتا ہوں کہ یہہ سب لوگ اس کی تاریخ کے تقاضے کو پورا کرنے میں ضروری ہماری مدد کریں گے کیونکہ یہہ لوگ ایک ایک کرکے لاکھوں پرائیوٹ ٹیڈرک بن جاتے ہیں، اس لئے انھیں اپنے امریکی حاکموں سے جنہوں نے کوریا میں یہہ جنگ چھیڑی ہے ضرور یہہ کہنا چاہیئے کہ وہ اس جنگ میں سامراج کے ساتھ نہیں ہیں بلکہ ایشیائی عوام کے ساتھ ہیں انھیں ضرور یہہ کہنا چاہیئے کہ ہم ایشیا میں کسی "ازم" کے خلاف نہیں لڑنا چاہتے۔ چاہے وہ کمیونزم ہو یا بدھ ازم۔ یہہ ایشیا والوں کے لئے ہے۔ وہ جس "ازم" کو چاہیں رکھیں، ماریں، بڑھائیں، پھیلائیں۔ وہ اپنی قسمت کے مختار کل ہیں اور اگر امریکہ دوسری قوموں کی قسمتوں کا مختار کل بننا چاہتا ہے تو اس بے انصافی کی حمایت ہرگز نہیں کریں گے ہم سامراج کے نئے غلام نہیں بنیں گے، نہ یورپ میں، نہ امریکہ میں، نہ کوریا میں، نہ ایشیا کے کسی میدان میں۔ عوام کو خود ان کی تقدیر بنانے دو پھر دیکھو وہ کتنی اچھی تقدیر بناتے ہیں۔

میرے خط سے تم کہیں یہہ نہ سمجھ لو کہ مجھے تمہاری موت کا افسوس نہیں ہے، ایسا نہیں ہے بات صرف یہہ ہے کہ آج میری آنکھوں میں تمہارے لئے آنسو نہیں ہے میں اپنے آنسو بہت عرصہ ہوا بہا چکا۔ میں نے اپنے دل میں اتنی غریبی اور سماجی بے انصافی دیکھی ہے کہ اسے دیکھ کر میری آنکھوں کے آنسو ختم ہوگئے ہیں، مگر میں تمہاری موت پر افسردہ اور سوگوار ہوں۔ میرے دل میں تمہارے قاتلوں کے خلاف غم اور غصے کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔ لیکن تمہارے اصلی قاتل کون ہیں۔ کیا وہ شمالی کوریا کا سپاہی جس نے اپنے اور اپنی بیوی اور بچوں کی حفاظت کا خیال کرتے ہوئے تمہارے سینے میں گولی اتار دی یا کوئی اور۔ یہہ بھی ایک دلچسپ کہانی ہے سنو گے؟

۱۹۰۵ء میں جبکہ روس اور جاپان کے درمیان لڑائی ہوئی تھی اور جاپان ساری

مخالفتیں طے کرتا ہوا چین میں گھس گیا تھا۔ یہ ان دنوں کی بات ہے کہ فتح مند جاپان کی فوجوں کے ہمراہ ایک نوجوان امریکی لفٹنٹ بھی تھا جو ویسٹ پائنٹ امریکہ سے بھیجا گیا تھا اس فوجی افسر کا نام میک آرتھر تھا اور یہ لفٹنٹ بظاہر ایک غیر جانبدار فوجی مبصر کی حیثیت سے جاپانی فوجوں کے ہمراہ سفر کر رہا تھا اب جب میں اس سارے واقعے پر غور کرتا ہوں تو مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شائد یہ لفٹنٹ میک آرتھر ۱۹۰۵ء میں بھی امریکی سامراجی اثر یورپ کے ایشیا میں اپنے لئے نئی تجارتی منڈیاں ڈھونڈ رہے تھے اور ایشیا کے ملکوں پر اپنی حریصانہ نگاہ جمائے بیٹھے تھے مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ۱۹۰۵ء میں لفٹنٹ میک آرتھر جس مشن پر آیا تھا وہ بڑی مشکل سے ۱۹۴۵ء میں پورا کر سکا۔ مجھے یہ گمان سا ہوتا ہے کہ ۱۹۰۵ء میں جب وہ امریکی لفٹنٹ کوریا کے سمندر میں اپنے جہاز پر سوار تھا تو تمہاری ولادت سے بہت پہلے تمہاری موت کا حکم سنا دیا تھا۔ آج جب میں اس امر پر غور کرتا ہوں تو اس طرح ٹھنڈے دل سے غور کرتے ہوئے تمہارے قتل پر میری آنکھوں میں آنسو نہیں آتے۔ غصے کے شعلے بلند ہوتے ہیں ان جابروں کے خلاف جنہوں نے انیس اور بیس برس کے امریکی لڑکوں کو کوریا کی قتل گاہ میں جھونک دیا۔ ان لڑکوں کو ابھی اسکولوں اور کالجوں میں پڑھنا تھا۔ انھیں تو جنگ کا کھیل نہیں فٹ بال اور ہاکی اور ٹینس اور بیس بال کھیلنا تھا ان کے سامنے ان کی پوری جوانی تھی جسے بسر کرنے کا انھیں پورا پورا حق تھا۔ یہ حق جس نے تم سے چھینا ہے میں اپنی آنکھوں میں آنسو لے کر اس کے خلاف نہیں لڑ سکوں گا۔ اس لئے کہ آج تمہارے لئے میری آنکھوں میں آنسو بہتے ہیں۔

مگر اس سے کہیں یہ نہ سمجھنا کہ مجھے تمہاری موت کا افسوس نہیں ہے۔ شاید تمہارے جنرل میک آرتھر کو بھی تمہاری موت کا اتنا افسوس نہیں ہوا ہوگا۔ جتنا مجھے ہے۔ کیونکہ جنرل میک آرتھر کے لئے تمہاری حیثیت اس کے فوجی نقشے پر ایک چھوٹے سے پن سے زیادہ نہیں ہے۔ لیکن میں جانتا ہوں اور اسے اس سے پہلے بھی ایک بار کہہ چکا ہوں کہ جب میدان جنگ

میں ایک سپاہی مرتا ہے تو کیا ہوتا ہے۔

جب سپاہی کینتھ شیڈرک، عمر ۲۰ سال، ساکن مغربی ورجی نیا۔ امریکہ کوریا کے میدان جنگ میں مر گیا تو اس کے ساتھ دُنیا کی بہت سی قیمتی چیزیں مر گئیں۔ اس کے ساتھ ایک کتاب مر گئی، ایک گیت مر گیا۔ کوئی تاج کی طرح خوبصورت عمارت مر گئی۔ سائنس کی کوئی نئی ایجاد، علم فن کا کوئی لافانی خیال مر گیا۔ جو آج تک کسی نے دریافت نہیں کیا اور ساری دُنیا کو اپنے پیچھے غمزدہ اور سوگوار چھوڑ گیا۔ شاید شیڈرک کی موت جنرل میک آرتھر کے لئے ایک پن کا نقصان بھی نہیں ہے لیکن آج وہاں جہاں ان سے محبت کرنے والے ایماندار لوگ بستے ہیں، وہ سچے دل سے شیڈرک کی موت کے لئے سوگوار ہیں۔ کیونکہ انھیں معلوم ہے کہ یہ موت بے کار تھی اس کا کوئی اچھا مصرف نہیں تھا، کیونکہ یہ دھرتی ہماری جس پر آج اس کا حال اتنا پتلا ہے۔ اپنی تمام صحرائی خامیوں کے باوجود بڑی ہی پُرکشش اور خوبصورت جگہ ہے۔ یہاں پر زرخیز کھیت اور وادیاں ہیں جن میں گیہوں، جو، باجرا، مکئی، دھان، روئی، پٹ سن کی کھیتیاں لہلہاتی ہیں یہاں پر سینکڑوں ہزار میل لمبی گھاٹیاں اور اونچے اونچے کوہستانی سلسلے ہیں جن کی گود میں زمرد کی طرح چمکتے ہوئے جنگل کھڑے ہیں اور جن کی چٹانیں سونے، چاندی، جست اور ہر قسم سے جگمگاتی ہیں۔ یہاں پر میلوں تک پھیلے ہوئے دریا اور وسیع جھیلیں ہیں جو اپنی کنواری چھاتیوں میں بجلی کی گرمی اور قوت کو ماں کے دودھ کی طرح چھپائے ہوئے ہیں۔ یہاں ہم سب لوگ آرام سے اور سکون سے اور بڑھتی ہوئی ترقی کے ساتھ رہ سکتے ہیں۔ یہ دھرتی اتنی امیر ہے، اتنی پیاری ہے، اتنی دولت مند ہے۔ اگر ہم کوشش کریں تو وہ ہماری بڑی سے بڑی خواہش کو پورا کرنے کی قوت رکھتی ہے۔

اور اگر کہیں ہم اس دُنیا سے پرے کائنات کے دوسرے گوشوں پر نگاہ ڈالیں تو ہمیں لاکھوں شمس و قمر، کروڑوں ستارے فضائے بسیط میں گھومتے ہوئے نظر آئیں گے اتنی ان گنت دنیائیں کہ اگر تھوڑی سی کوشش کرے تو ہر انسان کے لئے ایک ستارہ مل سکتا ہے۔ کائنات کا

یہ پھیلا ہوا عظیم الشان لامتناہی سلسلہ ہزاروں سالوں سے انسان کی جرأت آزمائی کا منتظر ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم کوریا کے ایک چھوٹے سے ٹیلے پر لڑنے کی بجائے اپنی نگاہیں زمان و مکان کی آخری حدوں تک پھیر دیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم کروڑوں اربوں روپیہ ایٹم بم اور ہائیڈروجن بم کی خطرناک اور انسان کش دریافتوں میں تباہ نہ کرتے ہوئے اس روپیہ کو علم اور سائنس اور فن کے صحیح مصرف میں لائیں تو انسان سچ مچ انسان بن کے کائنات کے مرکز میں کھڑا ہو سکتا ہے۔

یہ میرا گہرا اعتقاد ہے اور کامل یقین ہے اور جب میں یہ چند آخری سطریں تمہیں لکھتا ہوں تو میری نگاہ ایک لمحہ کے لئے سامنے کی کھڑکی سے باہر کے منظر پر جاتی ہے اور جہاں میں بیٹھا ہوں وہاں سے مجھے فطرت کا ایک حسین اور پرسکون منظر دیکھنے کو ملتا ہے۔ پنکھے کی طرح پھیلے ہوئے ناریل کے سرسبز و شاداب پتے تاڑ کے لمبے بانکے کھمبوں پر جھولتے ہیں، جو اندھیری کی جھاڑیوں سے فراز و نشیب میں گھٹتے ہوئے دور تک چلے گئے ہیں ان کے پرے دور ارکی وہ خوبصورت پہاڑیاں اور ٹیلے مون سون کی دھند میں کتنے ہی انجانے آسمانوں کی نیلاہٹیں لئے جگمگا رہے ہیں اور میں سوچتا ہوں دور ان ٹیلوں میں سے ایک ٹیلے پر تمہاری لاش ہے۔ اکیلی، ٹھنڈی، یخ بستہ، ایک گہرے سناٹے میں مستور اور مجھے تمہارا خیال آتا ہے۔ سپاہی کینتھ شیڈرک، مغربی ورجینیا کے رہنے والے، اور مجھے خیال آتا ہے۔ ان دوسرے سینکڑوں شیڈرکوں کا جو تمہاری طرح ۲۰ سال کے ہیں اور مغربی ورجینیا کے رہنے والے ہیں اور کنساس کے رہنے والے ہیں اور اوہیو اور سنسناٹی، ٹیکساس، بوسٹن اور شکاگو کے رہنے والے ہیں۔ سپاہی کینتھ شیڈرک جو ابھی بیس سال کے نہیں ہوئے جو ابھی انیس اٹھارہ، سترہ، سولہ برس کے ہیں۔ پھر مجھے اس کینتھ شیڈرک کا خیال آتا ہے، جو ابھی صرف تین سال کا ہے اور جو میرا بچہ ہے اور میں سوچ سوچ کے کہتا ہوں، نہیں، نہیں ایسا کبھی نہیں ہوگا۔ وہ اس میں سے پھر کوئی غلام نہیں گھڑ سکیں گے وہ اس کے ہاتھ میں بندوق تھما کے

کسی ٹیلے پر قتل کرنے کے لئے نہیں بھیج سکیں گے۔ اس لئے جب میں اپنی کھڑکی کے باہر دور اس ٹیلے پر تمہاری لاش دیکھتا ہوں تو اپنے لئے ایک فیصلہ کرتا ہوں۔ امن، امن آج اور ابھی۔ امن میرے زمانے میں، امن ہر زمانے میں۔۔۔۔!

پہلا اور تیسرا

پہلے درجہ میں لوگ کفن کی طرح اجلا لباس پہنے، سپرنگ والی نشستوں پر بیٹھے گاڑی لئے پر مومی بتوں کی طرح ہل رہے تھے۔ ان بتوں کے ہاتھوں میں اخبار تھے یا چمکیلے ریکی ناول، کھڑکی کے قریب جو عورت بیٹھی تھی، وہ بھی ایک آبی تصویر کی طرح ساکت جامد نظر آتی تھی۔ یہاں کوئی کسی سے بات نہ کرتا تھا۔ کوئی کسی کی طرف دیکھتا نہ تھا۔ یہاں موشی تھی، اور ایک طویل، گہرا سناٹا۔ اور رمیش کو معلوم ہوا جیسے وہ کسی ہزار ہا سال انے مندر میں آنکلا ہو۔ اور حیرت سے پتھر کے بتوں کو دیکھ رہا ہو.......

تیسرے درجے میں بڑی بھیڑ تھی۔ وہ بڑی مشکل سے دور آسکا۔ اور ڈبے کے وازے کے قریب ہی کھڑا ہو گیا۔ ذرا سی جگہ اُسے ملی جس میں وہ ایک پاؤں فرش پر اسکا۔ دوسرا پاؤں ٹکانے کی جگہ نہ تھی۔ دوسرا پاؤں اس نے ذرا پیچھے سرکایا تو سیاہ مکیلے بالوں والی سانولی کریچین حسینہ نے اس کی طرف سوالیہ انداز میں دیکھا۔ مگر یش بھی مجبور تھا۔ اب اس کی ایک ٹانگ ٹخنے سے لے کر ران تک اس سانولی لڑکی ٹانگ سے چپک گئی تھی۔ اور اب وہ دونوں ٹانگیں گاڑی کی ڈبل اسپرنگ کی طرح لنا کرتی تھیں۔ یہ محض اتفاق تھا، مگر انسانی جسم کو کیا کیا جائے۔ یہ بھی ایک مشین ہے۔ جب تک یہ مشین چلتی ہے حرکت کرتی ہے اس سے نتائج مرتب ہوتے رہتے ہیں انچہ لڑکی کا چہرہ بے حد ملیح ہو گیا اور رمیش کو اس کے بالوں سے خوشبو بھی آنے لگی۔ لڑکی کے چہرے پر پسینے کی ننھی ننھی بوندیں پھوٹ نکلیں، جیسے پھول کی پتیوں پر شبنم بکھر

جاتی ہے اور اس کے کان میں وہ آویزہ گاڑی کی لَے پر ڈول رہا تھا۔ شاید اب، رمیش کا دل بھی اس لَے پر ڈول رہا تھا، اور اس کا جی چاہا کہ وہ اس عیسائی حسینہ کو اپنی باہوں میں لپٹا لے۔ اور اس کے چھوٹے سے آدھ کھلے دہن پر اپنے ہونٹ رکھ دے، وہ تو خیریت ہوئی کہ لوکل فاسٹ نہیں تھی۔ اگلے اسٹیشن پر رک گئی اور یہاں بہت سے مسافر اُتر گئے اور دوسرے مسافروں کے ریلے کے اندر آنے سے پہلے اس عیسائی حسینہ نے اپنے لئے ایک سیٹ تلاش کر لی اور اپنے پھول دار نیلے سائے پر کمر سے کولھے تک ہاتھ پھیرتی ہو ایک ادھیڑ عمر کی ماہی گیر عورت کے پاس بیٹھ گئی۔ رمیش نے اور پھر اس عیسائی لڑکی نے ایک لمحے کے لئے محجوب نگاہوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا، اُس ایک نگاہ میں کتنا ملال تھا۔ پھر دوسرے لمحے میں جیسے وہ برقی رو ٹوٹ گئی۔ اور پھر ایک دوسرے کے لئے اجنبی ہو گئے۔ لیکن ان دونوں کے درمیان ایک صدی ایسا لمبا لمحہ آیا تھا جب وہ دونوں مکمل اجنبی ایک دوسرے سے اتنے قریب ہو گئے تھے، جیسے دو چاہنے والے ہی ہو سکتے ہیں۔ اور رمیش سوچنے لگا یہ انسانی جسم بھی کتنی عجیب و غریب مشین ہے جب برقی رو کٹ جاتی ہے تو جذبات کام نہیں کرتے، اور جب تک برقی رو جاری رہتی ہے ساری کائنات رقص کرتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔

اس ریلے میں دو سرکاری چپراسی داخل ہوئے اور تین چار سادھو اور ایک بھیک مانگنے والا جو مختلف جانوروں کی بولیاں بول کر پیسے مانگ رہا تھا۔ یہ بھک منگا دونوں آنکھوں سے اندھا تھا، اور اس کا سر گھٹا ہوا تھا۔ اور اس کے چہرے پر چیچک کے داغ تھے۔ اور وہ کبھی اپنا داہنا ہاتھ منہ پر رکھ کے اور کبھی بایاں ہاتھ اور دایاں ہاتھ دونوں اپنے منہ کے قریب لے جا کے مختلف آوازیں نکالتا تھا۔

یہ کوا بولتا ہے "کائیں کائیں"

اندھے تم نے کبھی کوا دیکھا ہے۔ جب وہ اپنے سیاہ چمکیلے پروں کو پھیلا کر نیلے

آسمان میں پرواز کرتا ہے اور شریر بچوں کی طرح شور مچاتا ہے۔

یہہ پہاڑی کوا ۔۔۔۔۔۔

پہاڑی کوا؟ تو نے پہاڑ دیکھے ہیں اندھے۔ اونچے اونچے پہاڑ جن کی سر بفلک چوٹیوں پر سفید برف ہوتی ہے، جن کے سینے سے دودھ آبشار بہتے ہیں۔ اور جنگل کے سبز پیراہنوں میں گلہریاں اور خرگوش، اور چھوٹے چھوٹے بندر اور لنگور اور خوبصورت پروں والے تیتر اپنی زندگی کی خوبصورت تصویریں بناتے ہیں۔ پھر کبھی کبھی کسی کھڑک کے تنے سے لگا ہوا کوئی ریچھ چاروں طرف دیکھتا ہے اور ہوا میں اپنی تھوتھنی کو اونچا کرکے شہد کے چھتوں کی خوشبو سونگھتا ہے۔

یہہ ہوائی جہاز کی آواز ۔۔۔۔۔۔۔

تو نے ایلومونیم کا وہ سفید پرندہ نہیں دیکھا جو پر دیکر گھماتے ہوئے چار انجنوں شور مچاتے ہوئے فضا میں اڑتا ہے اور جس کے پیٹ میں انسان اس طرح بیٹھتے ہیں، جس طرح اس گاڑی کے ڈبے میں مسافر بیٹھتے ہیں۔ مگر ہوائی جہاز میں ایسی بھیڑ نہیں ہوتی ایسے بھک منگے کبھی نہیں ہوتے۔ وہاں آرام دہ کرسیاں ہوتی ہیں، اور خوبصورت پردے ہوتے ہیں اور سیم تن نازک بدن حسین عورتیں مسافروں کو رنگا رنگ کاغذوں میں لپٹے ہوئے سوندھے سوندھے چاکلیٹ کھلاتی ہیں۔

ماہی گیر عورت، جو بیڑی پی رہی تھی اس نے اندھے کو ایک آنہ دیا اور بولی جا۔ اب دفان ہو کسی دوسرے ڈبے میں جاکے یہہ پہلیاں سنا۔ بہت مغز چاٹ لیا تو نے۔

اتنا کہہ کے وہ خوب کسمسا کے بیٹھ گئی۔ عیسائی لڑکی پھر سمٹ گئی۔ ماہی گیر عورت نے خالی ٹوکری جس میں مچھلیوں کی باس رچی ہوئی تھی اپنے ہاتھوں سے خوب اچھی طرح تھپتھپائی۔ اسے جھاڑ پونچھ کے سیٹ کے نیچے رکھ دیا۔ اور خوب زور زور سے بیڑی پینے لگی، اور کرسچین لڑکی سے کہنے لگی۔ مچھلی تو بڑے شوق سے کھاتی ہے اور

اب یہاں ناک پر رومال رکھتی ہے، تیری یہہ ٹین ایسی ناک سڑ تو نہیں جائے گی بھلا،
کر سیجن حسینہ نے ناک سے رومال ہٹا لیا۔ آس پاس کے لوگ ہنسنے لگے۔ ماہی گیر
عورت بھی ہنسنے لگی، اور زور زور سے بیڑی پینے لگی، ہنسنے اور بیڑی پینے کے درمیا
اُسے کھانسی آگئی، اب وہ ہنس رہی تھی اور بیڑی کا دھواں اس کے نتھنوں سے نکل رہا
اور اس کی آنکھوں کے نیچے اور کنپٹیوں کے قریب کی جھریاں گہری ہو گئی تھیں اور کانو
میں سونے کا بوجھل ڈیگڑا کسی طلائی مچھلی کی طرح لٹک رہا تھا۔ جیسے مچھلی کانٹے میں پھنس
کر بار بار تڑپ رہی ہو۔

ایک سادھو دوسرے سے مخاطب ہو کے کہنے لگا۔ کل نرگس کی نئی تصویر دیکھ
رہی بولی سینما میں واہ وا، مجا آگیا، رام جانے لڑکی کیا ہے، امرت کا گھونٹ ہے
تو نے رسی بولی کی تصویر دیکھی ہے؟

نہیں گورو! اپن کے پاس اتنے پیسے کہاں ہوتے ہیں۔ پرسوں میرے گورو
سیٹھ کھم سرٹل کے ہاں دکشنا ملی تھی ساڑھے آٹھ آنے گورو نے مجھے بھی دیئے، بد
تو سرکس دیکھ آیا، مگر رام جانے سرکس کی چھوکریوں میں وہ دم نہیں ہے اب کے
گورو نے آنکھ کھولی۔ وہ سیٹ پر ہی بیٹھے بیٹھے بھنگ اور چرس کے مراقبے میں چلے
گئے تھے۔ اب کے انھوں نے اپنے چیلوں سے جو یہہ گفتگو سنی، تو انھوں نے ایک آنکھ کھو
اور شکایت کرنے والے چیلے سے کہا۔ کل تجھے دس آنے دوں گا، رام پان میں سوکھنا ساد
کو دیکھ آئیو۔ بالکل سیتا ماتا معلوم ہوتی ہیں، گنگا مائی کی طرح شانتی اور نرمل۔
چھوٹا چیلا ٹھنکنے لگا۔ نہیں گورو ہم تو نرگس کی نئی تصویر دیکھیں گے۔ سُنا ہے اُ
میں ایک ڈانس بہت اچھا ہے

گورو بولے، ابے جا۔ وہ ڈانس کیا ہوگا۔ یاد ہے اپنے گاؤں کی وہ تھاری چمار
گنگا میا کی سوگند لے لو۔ اُس سے اچھا کون ناچے گی۔ کیوں بے بھورے یاد ہے

وہ برسات کا میلہ۔

بڑا چیلا اپنے ہونٹ تر کرتے ہوئے بولا۔ تمہاری چمارن کا تو جواب نہیں ہے گورو میں تو سمجھتا ہوں اب کے تم سردیوں میں دیس جاؤ تو اُسے ساتھ ہی لیتے آؤ۔ بے کار ہیں اُسے یہاں سے ہر مہینے منی آرڈر بھیجتے ہو۔ یہیں ایک فلم کمپنی کھول دیں گے۔ کیوں بے چچا۔

چچا بڑے گورو کا پاؤں دابنے لگا، ہاں میرے گورو ہو جائے پھر۔

بڑے گورو مسکرائے۔ انھوں نے لنگوٹ کی تہہ میں ہاتھ ڈال کے ایک چونّی اور تین دوّنیاں نکالیں اور انھیں چھوٹے چیلے کی ہتھیلی پر رکھ کے کہا، جا تو بچّہ ہے ابھی نرگس کی فلم دیکھ آ۔ میں تو موہ مایا سب تیاگ چکا۔ خالی رام کا نام لیتا ہوں۔ بڑے گورو نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور گانجے کے مراقبے میں چلے گئے۔

چند کلرک آمنے سامنے کی دو سیٹوں پر بیٹھے بڑے زور سے بحث کر رہے تھے۔ ریلوے ہڑتال نہیں ہوئی، اچھا ہوا۔ کمیونسٹ بہت شور مچاتے تھے۔ سالوں کی بڑھیا بیٹھ گئی۔ بہت اچھا ہوا۔

کیسے اچھا ہوا، ایک پارسی کلرک نے ناک میں گنگناتے ہوئے کہا۔

ارے ملک میں بڑا خطرہ تھا۔ نصروانجی بھائی۔ تم کیا جانو۔ گجرات میں کال پڑا تھا۔ اگر ہڑتال ہو جاتی تو لوگ بھوکے مر جاتے۔

اب کیا گجرات میں کال ختم ہو گیا ہے۔ مہنگائی ختم ہو گئی ہے، بھوک ختم ہو گئی ہے؟ تیسرا کلرک بولا۔

دوسرا کلرک بولا:۔ "ہاں اس کا جواب دو"۔

پہلا کلرک بولا۔ آہستہ آہستہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ابھی تو اپنی حکومت آئے دو سال بھی پورے نہیں ہوئے۔

دوسرا بولا۔ دو سال ہی میں کیا کم ہوا ہے، مہنگائی کہاں سے کہاں چلی گئی۔ پسیح

جانو میں نے چھ مہینے سے جُراب نہیں پہنی۔ بڑا لڑکا میں نے اسکول سے اُٹھا لیا۔

وہ کیوں؟

فیس دوگنی ہوگئی، کتابوں پر محصول لگا دیا، بچے کو کہاں سے پڑھاؤں۔ میں نے اسے واشنگٹن کے محکمے میں چپراسی کی ملازمت دلوادی ہے۔ دیکھ لینا ایک روز ترقی کرتا کرتا وزیر اعظم بن جائے گا۔

سب کلرک ہنسنے لگے۔ پہلا کلرک کہنے لگا، مگر مجھے تو کمیونسٹوں کی ہار پر خوشی ہے۔ ہڑتال سے پہلے کتنا اُچھلتے تھے۔

تمہارے سوشلسٹوں نے عین وقت پر دھوکا دیا۔ پارسی بولا۔

مگر کوئی تو آتا، کہیں پر تو کچھ ہوتا۔ سب بھیگی بلّی بن کے بیٹھ گئے۔ ایک مزدور بھی نہیں اُٹھا۔ اور یہ لوگ ہندوستان پر حکومت کرنا چاہتے ہیں۔ یہ گنوار مزدور اور جاہل کسان۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں ان لوگوں کو جتنا دبا کے رکھا جائے اتنا ہی یہ ٹھیک رہتے ہیں۔ ذرا ڈھیل دے دو تو سر پر چڑھ جاتے ہیں۔ سرکار نے ٹھیک کیا۔

ایک اور آدمی بولا۔ تو ہارنے کو دیکھا نہیں تھا، چپے چپے پر پولیس اور فوج کا پہرہ تھا۔ ریل کی پٹڑی پر، اسٹیشنوں پر، کارخانوں پر، لوکو ورکشاپ میں۔ سُنا ہے کوئی ہل نہیں سکتا تھا، حکم تھا۔ کوئی ذرا چین چپٹ کرے اسے گولی سے اُڑا دو۔

ایک آدمی جس کی داڑھی بڑھی ہوئی تھی۔ اور جس کے رخسار اندر کو دھنسے ہوئے تھے۔ اور جس کے گھٹنوں پر تیل کے بڑے بڑے داغ تھے اور میل کی تہیں۔ اور جو بڑی بے چینی اور پریشانی سے یہ گفتگو سن رہا تھا۔ یکا یک اُٹھ کھڑا ہوا اور اس نے اس کلرک کو جو گولی سے اڑا دینے کا ذکر بڑی شیخی سے کر رہا تھا، زور سے ایک طمانچہ مارا، طمانچہ اس زور کا تھا۔ کہ کلرک کا منھ دوسری طرف گھوم گیا۔ اور اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اتنے میں دوسرے لوگوں نے مزدور کو پکڑ لیا۔

مزدور نے زور سے اپنی باہیں چھڑالیں، اور کہا اب کے دیکھنا سالو۔
وہ لوگ اس پر پل پڑے۔ ایک کونے میں چار مارواڑی تاش کھیل رہے تھے۔ انھوں نے زور زور سے چلانا شروع کیا۔ پکڑو، پکڑو، اسے یہ کمیونسٹ ہے مارو، مارو اسے جان سے مار دو۔ پولیس کے حوالے کر دو۔

مزدور لڑ رہا تھا، لیکن وہ اکیلا تھا۔ اور وہ بہت سارے تھے، پھر بھی وہ دو چار آدمیوں کو خاطر میں نہیں لاتا تھا، اس نے مدد کے لئے ادھر ادھر دیکھا۔ دور ایک کونے سے ایک آدمی اٹھا۔ اس نے بڑے صاف ستھرے کپڑے پہن رکھے تھے۔ اس نے آکے کارکوں کو پیٹنا شروع کیا، پھر ماہی گیر عورت بیڑی کا دھواں لگاتی ہوئی اٹھی اور اس نے مچھلی والی ٹوکری لوگوں کے سر پر دے ماری اور چیخنے چلانے اور گھونسے مارنے لگی، ایک گھونسا غلطی میں رمیش کے بھی لگا۔ اور اسے معلوم ہوا کہ مچھلی بیچنے والی عورت کا گھونسا کتنا تگڑا ہوتا ہے۔ اور پھر ایک عورت آگئی اور اس نے بھی بڑے اچھے اور رنگین کپڑے پہن رکھے تھے۔ اور وہ بھی پھٹے پرانے کپڑے پہنے ہوئے مزدور کی حمایت میں لڑنے لگی۔ ایک سادھو کا کمنڈل ایک مارواڑی کے سر پر اوندھا ہو گیا۔ اور اس میں سے دال، چاول، سنگترے کی قاشیں، چنبیلی کے پھول، بیگن کی بھاجی اور پسی ہوئی سرخ مرچیں چاروں طرف پھیل گئیں، اور لوگ کھانسنے لگے، اور مارواڑی چلانے لگے اور کسی نے ان کے تاش اٹھا کر باہر پھینک دیئے۔ کسی نے پگڑی اچھال دی، اور وہ مارواڑی رونے لگے اور چلانے لگے۔ کمیونسٹ آگئے، زنجیر کھینچو۔ ہڑتالی آگئے، ہڑتالی آگئے۔

یکا یک گاڑی کھڑی ہو گئی، اور پھر پولیس آگئی۔

جب مجمع ذرا چھٹا، تو معلوم ہوا کہ میلے میلے گھٹنوں والا مزدور غائب ہے۔ اور ماہی گیر عورت کا ٹوکرا ٹوٹ گیا ہے۔ اور نوجوان عورت کا رنگین لباس جگہ جگہ سے پھٹ گیا ہے۔ اور صاف ستھرے کپڑے پہننے والے نوجوان کا منھ نوچا ہوا تھا اور اس کے ہونٹ

سے خون نکل رہا ہے، لیکن ماہی گیر عورت کا زیادہ نقصان نہیں ہُوا۔ ہاں وہ ان لوگوں کی گت دیکھ کر ہنس رہی تھی، جنہوں نے مزدور کو پکڑنا چاہا تھا، پولیس نے اُسے پکڑ لیا مار واڑی ہاتھ بڑھا بڑھا کر گرجنے لگے، یہی تھی جو اس کے لئے لڑ رہی تھی۔ اور یہ آدمی یہ عورت، یہ لڑکی، یہ جوان، یہ بابو اور وہ کم بخت ہڑتال کرانے والا کمیونسٹ تھا۔ اس کو انھوں نے بھگا دیا۔

ماہی گیر عورت نے چلّانے والے مار واڑی کی طرف اپنی ٹوٹی ہوئی ٹوکری زور سے پھینکی، جو ٹھیک اس مار واڑی کے گلے میں آویزاں ہو گئی۔ سب لوگ ہنسنے لگے۔ ماہی گیر عورت بولی تو لڑائی میں حصّہ کیا لیگا، تو نہ مرد ہے، نہ عورت، تو دلّال ہے دلّال۔ دونوں طرف سے کمیشن کھاتا ہے۔ بنیے جیسا مار واڑی ایک ہمارے وار سوا میں بھی تھا، وہ ہماری مچھلیوں کو اپنے ٹرکوں میں بھر کر شہر لے جاتا تھا اور سارا پیسہ خود ہڑپ کر جاتا تھا۔ اب ہم سارے گاؤں کے ماہی گیروں نے مل کر اپنی ٹرک لے لی ہے۔ خود مچھلی سمندر سے نکالتے ہیں اپنی ٹرک میں لے جا کے شہر میں بیچتے ہیں۔ پہلے میرے کان میں ایک چاندی کی بالی نہیں تھی اب دیکھ یہ سونے کا بگڑا۔ تیری چپڑی کھچڑی بیوی کے پاس بھی ایسا نہ ہوگا۔

پولیس والے اُس سے پوچھنے لگے کون تھا وہ؟

وہ بولی۔ وہ میرا بیٹا تھا۔

ہاں، وہ میرا بیٹا تھا۔ وہ جہازی تھا نا وار سوا میں۔ جب جہازیوں کی ہڑتال ہوئی۔ تو اُس نے اکیلے پانچ گوروں سے لڑائی کی، تم لوگ نہیں جانتے ہو اور اکھباروں میں بھی یہ کسی کو معلوم نہیں، مگر وہ میرا بیٹا تھا، اور میں نے اپنی آنکھوں سے اُسے پانچ گوروں سے لڑتے ہوئے دیکھا۔ اور آج جو آدمی یہاں سے بھاگا، وہ بھی میرا بیٹا تھا، کیونکہ وہ بھی اسیطرح کی ہڑتال چاہتا تھا، جس کے لئے میرا بیٹا مارا گیا۔ اس لئے میں نے اُسے بچا لیا۔ اب تمہارا جہاں جی چاہے لے چلو۔

پولیس والوں نے اُسے گاڑی سے نیچے اتار لیا۔ گاڑی کے چلتے چلتے رمیش نے دیکھا۔ کہ وہ عورت پولیس والے سے ماچس مانگ رہی ہے ماچس لے کر اس نے اپنی بیڑی سُلگائی، اور ماچس کی روشنی اس کی گہری آنکھوں میں چمک اُٹھی، اور اس کی آنکھوں کے نیچے اور کنپٹیوں کے ارد گرد جھرّیاں گہری ہوگئیں اور طلائی بگڑا اس کے کانوں میں بار بار غصّے سے ہلنے لگا۔ پھر گاڑی آگے نکل گئی۔

رمیش ایک سیٹ پر بیٹھ گیا، اس کے قریب ہی وہ نوجوان جس نے اچھے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ اس نوجوان عورت کے قریب بیٹھا ہوا تھا۔ جس کا رنگین لباس بھی جگہ جگہ سے پھٹ گیا تھا۔ وہ نوجوان رمیش کی طرف دیکھ کے مسکرایا۔ اور بولا "وہ بچ گیا اب بات نہیں آئے گا۔"

اس نے سر ہلا دیا، نہیں، میں جانتا نہیں ہوں، مگر وہ بھی میری طرح کوئی مزدور دکھائی دیتا تھا۔

رمیش نے پوچھا تم مزدور ہو؟ مگر تمھارے کپڑے تو.....

اس نے جواب دیا۔ ہمارا آج ہی بیاہ ہوا ہے۔ یہ بیاہ کے کپڑے تھے میرے بھی اور اس کے بھی۔ اور اس نے اپنی بیوی کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا..... بڑی مشکل سے یہ کپڑے سلائے تھے، خیر کوئی بات نہیں اپنا ساتھی تو بچ گیا۔

وہ اپنی نوجوان بیوی کی طرف دیکھ کے مسکرا دیا۔ اس کی بیوی نے اسے پیار بھری نظروں سے دیکھا، اور پھر اپنے ہاتھ میں رکھے ہوئے امرود کو اس نے دانتوں سے کاٹا اور لجائی ہوئی دلیری سے اس چھوٹے امرود کو اپنے خاوند کے ہونٹوں پر رکھ دیا۔

نوجوان مزدور امرود کھانے لگا، اور اس کے مضبوط ہاتھ نے بیوی کو اپنے شانے سے لگا لیا۔

رمیش آہستہ سے وہاں سے اُٹھ گیا۔ دوسری طرف ڈبّے کے دروازے کے قریب

مارواڑی اپنی پگڑیاں اور اچکنیں اور دھوتیاں درست کر رہے تھے۔

ایک مارواڑی نے اپنی جیب سے تاش نکالتے ہوئے کہا۔ کیا ہوا مچھلی والی نے تاش باہر پھینک دی۔ ہمارے پاس دوسری تاش ہے۔

رمیش نے مارواڑیوں کے اوپر جھک کے کہا تمہارے پاس صرف ایک تاش ہے لیکن مچھلی والی کے پاس سارا سمندر ہے۔ اور اس کی ساری مچھلیاں ہیں تم اُسے جیت نہیں سکتے۔۔۔۔۔

لوگ کفن کی طرح اُجلا لباس پہنے اسپرنگ والی نشستوں پر بیٹھے گاڑی کے پر مومی بتوں کی طرح ہل رہے تھے ان بتوں کے ہاتوں میں اخبار تھے اور چمکیلے امریکی ناول کھڑکی کے قریب جو عورت بیٹھی تھی۔ وہ بھی ایک بے جان آبی تصویر کی طرح ساکت و جامد نظر آتی تھی، یہاں کوئی کسی سے بات نہ کرتا تھا، کوئی کسی کی طرف دیکھتا نہ تھا۔ یہاں خاموشی تھی اور ایک طویل گہرا سناٹا، اور رمیش کو معلوم ہوا جیسے وہ کئی ہزار سال پرانے مندر میں آنکلا ہو اور حیرت سے پتھر کے بتوں کو دیکھ رہا ہو؛

سڑک کے کنارے

میں سڑک کے کنارے کنارے چل رہا ہوں اور جھیل ڈل کا نظارہ کر رہا ہوں۔ میں بہت مدت کے بعد کشمیر آیا ہوں۔ لیکن ڈل مجھے اسی طرح جوان اور خوبصورت نظر آتی ہے۔ اس کے گہرے نیلے پانیوں میں شنکر آچاریہ کے منار کا عکس لرز رہا ہے۔ اور سرخ پروں والے سُبک خرام شکارے پانی کی سطح کو چیرتے ہوئے نشاط باغ کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ جب یہ شکارے پانی میں تیرتے ہوئے نیلوفر کے پھولوں کے قریب سے گزرتے ہیں تو نیلوفر کے خوابیدہ پھولوں پر پانی کی پھواریں پڑجاتی ہیں اور وہ چونک کے پانی کی سطح پر دوڑنے لگتے ہیں۔ شکارے آگے بڑھ جاتے ہیں اور شکاروں میں بیٹھے ہوئے مرد و زن اور شکاروں کے کاگیت ڈل کے اُجلے اُجلے پانیوں سے اُبھرتا ہوا آرہا ہے۔

باغ نشاط کے گلو
شاد رہو جواں رہو
تم پہ نثار جنتیں
روح فزا مسرتیں
رنگ بہار نکہتیں
مست نشے میں رات دن
خرم و شادماں رہو
باغ نشاط کے گلو!

ہاں یہ میرا وہی جانا پہچانا کشمیر ہے جس کے بیٹوں نے ہزار مصیبتوں کے ہوتے ہوئے بھی اپنی حسن کاری نہیں کھوئی۔ اپنے گیت نہیں کھوئے۔ زندہ رہنے کی آرزو، اور ہنستے ہوئے محنت کرنے کی اُمنگ نہیں کھوئی۔ یہ میرا وہی جانا پہچانا کشمیر ہے۔

میں سڑک کے کنارے کنارے چل رہا ہوں۔ یہ سڑک جو سری نگر سے اننت ناگ کو جاتی ہے، اس راستے میں شعلہ رو چنار ہیں اور باداموں کے بانکے پیڑ، ناشپاتیوں کے جھنڈ اور سیب کے درخت۔ برف زمین میں گھل گئی ہے اور ابھی ابھی تو بہار کا سبزہ بن کر پھوٹی ہے سیب کی شاخوں پر کلیاں چٹک گئی ہیں اور اُن کی گلابی مسکراہٹیں جگہ جگہ رستہ چلنے والوں کے قدم روک لیتی ہیں۔ میں بھی یہاں ٹھٹھک جاتا ہوں کیونکہ یہاں سیب کے پھولوں میں ایک چشمہ ہے۔ ایک گائے ہے اور ایک حسین چرواہی ہے جو گائے کو چشمے سے پانی پلا رہی ہے۔ میں لڑکی سے کہتا ہوں "تم ذرا گائے کو پرے ہٹا لو تو میں پانی پی لوں"۔

لڑکی:۔ تم ذرا پرے ہٹ کے بیٹھ جاؤ اور گائے کو پانی پی لینے دو۔ وہ تمہارے سامنے سے ڈرتی ہے۔"

میں:۔ "مجھے سخت پیاس لگی ہے"

لڑکی:۔ "پیاس انسان اور حیوان دونوں کو برابر لگتی ہے"

میں:۔ "پہلے میں پانی پی لوں"

لڑکی:۔ "پہلے گائے پانی پی لے۔ گائے تو دیکھتے نہیں ہو پانی پی رہی ہے اسے بیچ میں سے کیوں ہٹا دوں؟ تم پانی پی رہے ہوتے تو میں تمہارے ہاتھ سے پانی کا پیالہ چھین لیتی؟"

میں:۔ (ہنس کر) تم بڑی سمجھدار معلوم ہوتی ہو، مگر حیرت ہے اتنی سوجھ بوجھ رکھتے ہوئے بھی تم چرواہیوں کا کام کرتی ہو؟

لی:۔ چرواہیوں کے کام کے لئے تو بڑی سوجھ بوجھ چاہیئے۔ گائے بھینسوں کے ریوڑ سنبھالنے کے علاوہ اسے تمھارے ایسے راہ پر چلتے ہوئے عقلمندوں سے بھی تو نپٹنا ہوتا ہے۔

(دونوں ہنستے ہوئے)

ں:۔ "تمہارا نام بیگماں ہے نا؟"

لی:۔ (ہنس کر) "نہیں، میرا نام زینب ہے۔ میں یہاں گاؤں کے اسکول میں پڑھاتی ہوں۔"

ں:۔ "اسکول میں پڑھاتی ہو کہ گائے بھینس چرا جاتی ہو؟"

لی:۔ "یہ گائے تو ایک اندھے لڑکے کی ہے جس کے ماں باپ پنجاب کے فساد میں مارے گئے تھے، وہ اپنا وطن چھوڑ کے محنت مزدوری کے لئے پنجاب گئے تھے، پھر انھیں آنا نصیب نہ ہوا۔"

ں:۔ "یہ اندھا لڑکا کیسے بچ گیا؟ کیا یہاں تھا؟"

لی:۔ یہ بھی اپنے ماں باپ کے ساتھ کچھ فسادی اسے بھی مارنے پر تُلے ہوئے تھے مگر کچھ انھوں نے رحم کھا کر صرف اس کی آنکھیں نکال لیں اور اسے زندہ چھوڑ دیا اس نے اس دن سے کوئی فساد نہیں دیکھا۔ فساد کو سُنا ہے صرف۔ ایسی ایسی بھیانک آوازیں سُنتا ہے کہ رات کو سوتے سے جاگ کر چیخنے لگتا ہے۔ مجھے بچاؤ، مجھے بچاؤ۔"

ں:۔ "خیر وہ زمانہ اب گزر گیا۔"

لی:۔ (آہ بھر کے) "ہاں لیکن اس بچے کو روشنی نہیں ملے گی، نہ ہی میرا شوہر مجھے ملے گا۔"

ں:۔ "تمہارا شوہر؟"

لی:۔ ہاں وہ ہمارے گاؤں کے اسکول میں بچوں کو پڑھاتا تھا۔ اب اس کی جگہ میں پڑھاتی ہوں۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو چاہتے تھے۔ لیکن یہ فساد سے پہلے کی بات ہے۔

وہ مجھے چھُپ چھُپ کے پڑھایا کرتا تھا۔ اور میرے ماں باپ میری شادی نمبردار کے لڑکے سے کرنا چاہتے تھے اور میں چھُپ چھُپ کے پڑھتی تھی اور نمبردار کے بیٹے پر سولعنت بھیجتی تھی پھر میری شادی کی بات پکی ہوگئی اور پھر دنگے فساد کی خبریں آنے لگیں اور پھر جب میری شادی میں چند دن رہ گئے تو یہ اندھا لڑکا گھوما گھوما بھیک مانگتا واپس گاؤں میں آنکلا۔ اسکو اس حالت میں دیکھ کر گاؤں والوں کے غصے کی کوئی حد نہ رہی۔

(مجمع کا شور)

(ڈھول پیٹنے جارہے ہیں۔ لوگ ہنس رہے ہیں، چیخ رہے ہیں، اس بے ہنگم شور میں ذیل کی آوازیں اُبھرتی ہیں۔)

۱۔ "مارو، مارو! ان سب کو مارو ایک بھی بچنے نہ پائے!"

۲۔ "ایک آنکھ کے بدلے دونوں آنکھیں نکال دو!"

۳۔ "بنیئے کا گھر جلا دو"۔

۴۔ "لالے اور اس کی بیٹی کو زندہ زمین میں گاڑ دو"۔

۵۔ "چلو۔ جوانو! مارو، مارو، مارو!"

۶۔ "ہم خون کا بدلہ چکائیں گے! اپنے دشمنوں کا خون بہائیں گے!"

لڑکی:۔ آن کی آن میں سارا گاؤں اکٹھا ہوگیا۔ دوسرے فرقوں کے لوگوں نے گھبرا کر گھر چھوڑ دیئے اور بھاگ کر اسکول کی چہار دیواری میں پناہ لی۔ گاؤں والے اسکول کے گرد گھیرا ڈال لیا۔ اندر اسکول میں اُستاد پڑھا رہا تھا۔

اسکول ماسٹر:۔ "بچو! بچو! سب انسان بھائی بھائی ہیں"۔

باہر سے آوازیں:۔ "مارو، مارو۔ سب کو مارو!"

اندر کی آوازیں:۔ ہمیں بچاؤ۔ کسی طرح سے ہمیں بچاؤ۔

ہم نے کوئی گناہ نہیں کیا ہے۔ ہم تو سیکڑوں سالوں سے یہاں رہتے چلے آئے ہیں
استاد جی! آپ نے کبھی دیکھا ہم نے گاؤں والوں کے خلاف کوئی بات کی ہو۔
"یہ لیجئے زیور، میری بیٹی کی عزت بچا لیجئے۔
باہر کی آوازیں:۔ زندہ گاڑ دیں گے۔ پتھروں سے ہلاک کر دیں گے۔ تیل میں تل دیں گے!
اندر کی آوازیں:۔ ہم نے کچھ نہیں کیا ہے۔ یہاں سے چار سو میل دور جن لوگوں نے تمہارے
گاؤں والوں کی جانیں لی ہیں تم اس کا بدلہ اُن سے لو۔ ہم سے کیوں لیتے ہو؟"
ایک لڑکی:۔ بھائی میں تو گاؤں کی کنواری ہوں میں تمہاری عزت ہوں۔ مجھے بچا لو
بھائی"
ایک لڑکا:۔ "استاد جی! ہم کیا پڑھیں، سب انسان بھائی بھائی ہیں۔؟
استاد:۔ "چپ رہو۔ میں باہر جاتا ہوں"
(قدموں کی آواز، باہر کا شور ایک دم بڑھ جاتا ہے۔ مارو، مارو ٹکڑے ٹکڑے
کر دو۔ قیمہ بنا دو۔ نکالو سب کو باہر، ایک کو زندہ نہیں چھوڑیں گے)
استاد:۔ گاؤں والو! میری سنو۔
(سب چپ ہو جاتے ہیں، پھر ایک دم چلانے لگتے ہیں)
"نہیں۔ ہم نہیں سنیں گے۔ ہم کسی کی نہیں سنیں گے۔ ہمیں ان کا چاہیئے۔ لہو خون۔
استاد:۔ تمہیں خون چاہیئے؟ میرا خون لے لو، لیکن یہ کہاں کا انصاف ہے کہ تم باہر
کے فسادیوں کا بدلہ اپنے گاؤں والوں سے لو۔
ایک آواز:۔ یہ اندھا لڑکا دیکھتے ہو، ان لوگوں نے اس کے ماں باپ کو مار دیا اس
کی آنکھیں نکال دیں۔ ہم بھی اب یہی سلوک کریں گے"
دوسرا:۔ "آگے ہٹ جاؤ استاد جی"
تیسرا:۔ "میں تم سے کہتا ہوں دروازے سے پرے ہٹ جاؤ"

استاد:۔ میں پیچھے نہیں ہٹوں گا مجھے پہلی جماعت کے قاعدے کی حفاظت کرنی ہے
جس میں لکھا ہے کہ سب انسان بھائی بھائی ہیں۔ اور مجھے میری پیاری اماں
جان اماں کی عزت بچانی ہے۔ میں نے دس برس اس قاعدے کو پڑھایا ہے
آج یہ قاعدہ تم میرے ہاتھ سے چھین رہے ہو؟ میں یہ قاعدہ نہیں دوں گا
اپنے جیتے جی میں اس کے ایک ایک حرف کی حفاظت کروں گا۔ گاؤں والو! اس
قاعدے کو نہ پھاڑو۔ یہ تمہارے بچوں کا قاعدہ ہے۔ اس میں سیب کے
پھول ہیں اور ناشپاتی کے درخت ہیں اور بھائی بہن مدرسے جا رہے ہیں اور
سورج نکل رہا ہے اور کسان کھیتوں میں ہل چلا رہا ہے۔ اس میں بچے ماں باپ
کا ادب کرتے ہیں اور سلیم مومن کا دوست ہے اور رضیہ نرملا کی سہیلی ہے۔ گاؤں
والو یہ تمہارے بچوں کا قاعدہ ہے۔ اسے قتل نہ کرو۔ نئی زندگی کو ختم ہونے نہ دو۔

ایک آواز:۔ کیا بکتا ہے۔ یہ پہلے اسی پر ہاتھ صاف کر دو۔ دشمنوں سے مل گیا ہے یہ۔

دوسری تیسری آوازیں:۔ ہاں ہاں مار ڈالو اسے، آگے بڑھو بھی۔ دیر ہو رہی ہے۔"

استاد:۔ "تمہیں بدلہ چاہیے نا؟ دو آنکھوں کے بدلے میری دو آنکھیں لے لو۔"

چوتھی پانچویں آوازیں:۔ دیکھتے کیا ہو جی آگے بڑھ جاؤ، یہ ماسٹر خود کو پیچھے ہٹ جائیگا

آوازیں:۔" چلو آگے بڑھو، ہاہا۔ ہاہا۔۔۔۔۔۔!

(شور کم ہو جاتا ہے لڑکی کی آواز ابھر آتی ہے۔)

زینب:۔ گاؤں والوں نے اسے مار ڈالا۔ اسکول کی چوکھٹ پر اسکول ماسٹر کا خون
بہا اس کے سرخ سرخ تازہ لہو کو دیکھ کر گاؤں والے اک دم چونک گئے۔ ان کا سارا
غصہ اس کے مقدس لہو میں ڈوب گیا اور وہ پریشان ہو کر پیچھے ہٹ گئے لوٹ کے
پریشان ہو کے اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے اور پھر اس واقعے کے بعد انہوں نے دوسرے
فرقے والوں کو کچھ نہیں کہا۔ ہمارے گاؤں میں اب سب امن چین سے رہتے ہیں اور

کوئی کسی سے بازپرس نہیں کرتا اور اب کہیں کوئی جھگڑا نہیں ہے"۔

میں:۔ اب شاید تمہارا بیاہ بھی نمبردار کے بیٹے سے ہو گیا ہوگا"۔

زینب:۔ کیسی باتیں کرتے ہو۔ میرا شوہر زندہ ہے۔ لوگوں کے لئے وہ مر چکا ہے۔ انہوں نے اسکول ماسٹر کی لاش کو قبر میں گاڑ دیا ہے۔ مگر میرے لئے وہ زندہ ہے اور اس کے جیتے جی میں نمبردار کے بیٹے سے کیسے شادی کر سکتی ہوں؟ اب میں ہر روز اسکول میں پڑھاتی ہوں اور ہر روز ارنڈ کے قاعدے میں اس کا مسکراتا ہوا چہرہ —— نظر آتا ہے اور پھر میں مسکرا کر اسکول کے بچوں کی طرف دیکھتی ہوں، تو وہ سب مجھے اپنے ہی بچے معلوم ہوتے ہیں۔ میرا شوہر، میرے بچے، (اندھے لڑکے کی گانے) میرا دیس کتنا خوب صورت ہے اجنبی! ——

—— تم کس دیس کے رہنے والے ہو اجنبی؟"۔

میں:۔ میرا کوئی دیس نہیں ہے میں انسانوں کی سڑک پر رہتا ہوں۔ چلتا ہوں اور کبھی کبھی رک کر کسی چشمے کی سطح سے ہونٹ ملا کے پیاس بجھا لیتا ہوں۔ اب تم اپنی گاگرے کو پرے ہٹا لو۔ یہ پانی پی چکی ہے اور سیمنٹ کے کوٹھا کی آئین چبا رہی ہے"۔

(ہنستی ہے اس کی گم ہوتی ہوئی ہنسی میں میوزک ابھر آتا ہے، چند لمحوں کے بیک گراؤنڈ۔ میوزک (نشاطیہ) کے سُر اونچے ہوتے جاتے ہیں پھر بکھر کر گم ہو جاتے ہیں۔)

میں پھر سڑک کے کنارے کنارے چل رہا ہوں۔ یہ سڑک جو متھن سے چٹاگام کو جاتی ہے۔ متھن ہندوؤں کا تیرتھ ہے۔ یہاں دُور دُور سے جاتری آتے ہیں اور شنکا کے مندروں اور رشیوں کے درشن کر کے امرناتھ کی طرف چلے جاتے ہیں۔ متھن

براہمنوں کی بستی ہے اور یہاں ہزاروں برس سے برہمن رہتے بستے آئے ہیں اور بے خوف وخطر پوجا پاٹ میں معروف نظر آتے ہیں۔

مٹن میں کوئی مسجد نہیں ہے حالاں کہ آس پاس کے دیہات مسلمان آبادی کی کثرت ہے۔ میرا مطلب ہے کہ پہلے مٹن میں کوئی مسجد نہیں تھی، اب کے جو کئی سالوں کے بعد میں آیا ہوں تو کیا دیکھتا ہوں کہ یہاں پر ایک چھوٹی سی مسجد بھی ہے۔ میں اس مسجد کو دیکھ کر بہت خوش ہوا اور دوڑا دوڑا ملّا جی کے پاس گیا۔ ملّا جی کا ایک ہاتھ کٹا ہوا تھا اور ان کی آنکھیں بڑی بڑی اور چمکیلی تھیں۔

میں:۔ "ملّا جی! یہ مسجد کب بنی؟"

ملّا:۔ "فساد کے دنوں میں۔"

میں:۔ "فساد کے دنوں میں! حیرت ہے۔ فساد کے دنوں میں تو مسجدیں اور مندر بنتے نہیں ہیں ٹوٹتے ہیں۔ آپ کیسی عجیب بات کہہ رہے ہیں۔"

ملّا:۔ ہمارا ملک کشمیر بڑا عجیب ملک ہے نا۔ اس لئے یہاں پر بڑی بڑی عجیب باتیں ہوتی ہیں۔"

میں:۔ پوری بات بتائیے۔"

ملّا:۔ جب تمہارے یہاں فساد ہو رہا تھا اور خون کی ندیاں بہہ رہی تھیں اور ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کے لہو کے پیاسے معلوم ہوتے تھے ان دنوں یہ فسادیوں نے یہاں ہمارے مٹن میں آکر بھی فساد کرنا چاہا۔ انہوں نے آس پاس کے دیہاتوں میں کسانوں کو بھڑکا دیا کہ وہ مٹن کے مٹھ پر حملہ کریں اور براہمنوں کو تہ تیغ کر کے اور مٹھ کو جلا کر ان مسجدوں کا انتقام لیں جنہیں بے حرمت کیا گیا ہے۔"

میں:۔ تو پھر کیا ہوا؟ مندر تو جلے نہیں وہ ویسے ہی موجود ہیں۔"

ملّا:۔ تم سنو تو۔ جب فسادی یہ کھچڑی پکا چکے، تو ان میں سے کچھ لوگ میرے پاس

فتویٰ حاصل کرنے کے لئے آئے۔ میں نے فتویٰ نہیں دیا۔ میں نے کہا "یہ ہمارے شعار کے خلاف ہے۔ اس پر وہ لوگ ناامید ہو کر چلے گئے۔

میں:۔ "پھر؟"۔

مُلّا:۔ لیکن فسادیوں نے ہمت نہیں ہاری۔ انھوں نے کسانوں کو ورغلانا شروع کیا اور آخر میں چند لوگوں کو مٹھ پر حملہ کرنے کے لئے تیار بھی کر لیا۔ جب مجھے اطلاع ملی میں یہاں نہیں تھا۔ ایک گاؤں میں گیا ہوا تھا۔ وہاں میں نے بہت سے کسانوں کو مٹھ کی حفاظت کے لئے تیار کر لیا۔ اور ہم لوگ راتوں رات مٹھ کے سامنے پہنچ گئے۔ بے چارے پجاری بہت ڈرے ہوئے تھے۔ دور سے ڈھول تاشوں کی آواز آ رہی تھی، فسادی قریب آ رہے تھے۔"

(مجمع کی آوازیں، ڈھول پیٹنے کی آوازیں)۔

آوازیں:۔

۱:۔ "یہاں مٹھ نہیں رہ سکتا"۔

۲:۔ "شہید مسجدوں کا بدلہ لیا جائے گا"۔

۳:۔ "جلا دو انھیں"۔

۴:۔ "پجاریوں کو چشمے میں پھینک دو"۔

۵:۔ "آگے بڑھو جوانو! لوہے کے جنگلے کو پار کر جاؤ۔ ان چشموں کی ساری مچھلیاں تمہاری ہیں"۔

مُلّا:۔ "ٹھہرو! تم لوگ اس جنگلے سے آگے نہیں جا سکتے"۔

آواز:۔ "کیوں نہیں جا سکتے؟ ہم سب کچھ پھونک کے رکھ دیں گے"۔

مُلّا:۔ یہ شعار اسلامی کے خلاف ہے۔

دوسری آواز:۔ "مُلّا دشمنوں سے مل گیا ہے"۔

تیسری:۔ آواز:۔ "ان کی طرفداری کر رہا ہے۔"
چوتھی آواز:۔ "ملّا جی سامنے سے ہٹ جاؤ۔"
"میرے جیتے جی تم اس مٹھ پر حملہ نہیں کر سکتے۔ تم لوگ جن کے بہکانے میں آکر حملہ کر رہے ہو وہ ہمارے دیس کو برباد کر دیں گے۔ میں تم سے پھر کہتا ہوں: میرے جیتے جی یہاں فساد نہیں ہو سکتا۔"
ایک آواز:۔ "ملّا جی ٹھیک کہتے ہیں۔"
دوسری آواز: "کیا خاک ٹھیک کہتے ہیں۔"
تیسری آواز:۔ "یہ لوگ ہمارے بھائی ہیں، ہزاروں برسوں سے یہاں رہتے چلے آئے ہیں"
چوتھی آواز:۔ "ان ہی کے بھائیوں نے وہاں آگ لگائی ہے۔ ہم یہاں لگائیں گے۔"
پہلی آواز:۔ "نہیں، تم میں ہمت ہے تو وہاں جا کے لڑو یہاں ہمیں کیوں برباد کرتے ہو۔"
دوسری آواز:۔ "آگے سے ہٹ جاؤ۔"
پہلی آواز:۔ "ملّا جی! سنبھلیے، سنبھلیے!"

(شور بڑھ جاتا ہے پھر آہستہ آہستہ کم ہو جاتا ہے۔ آخر میں ملّا جی کی آواز ابھرتی ہے)

ملّا جی:۔ اسی دنگے میں میرا ہاتھ کٹ گیا مگر مٹھ بچ گیا۔ کسانوں کو بہت جلد عقل آگئی کہ فساد کا انجام تو سیدھا کر رہے تھے۔ پجاریوں نے بھی میرا بہت شکریہ ادا کیا۔ اس سے پہلے یہاں مٹھ کے قرب و جوار میں کوئی مسجد نہ بن سکتی تھی۔ اب ان پجاریوں نے اور یہاں کے جاتریوں نے خود مسجد کے لئے چندہ جمع کیا اور اس کی تعمیر کے سلسلے میں سب سے پیش پیش رہے۔ یہ مسجد جو تم اب دیکھ رہے ہو اسی چندے سے بنی ہے۔

میں:۔ "ملّا جی، آپ بہت اونچے آدمی ہیں۔"
ملّا:۔ "میں ایک چھوٹا سا انسان ہوں بیٹا۔ ہاں میری مسجد بہت اونچی ہے۔ آسمان

تک جاتی ہے۔"

"(خوش آہنگ موسیقی چند لمحوں کے لئے بجتی ہے)

میں سڑک کے کنارے کنارے چل رہا ہوں۔ یہ وہ میرا جانا پہچانا کشمیر نہیں ہے یہ نیا کشمیر ہے۔ زینب کا، استاد جی کا اور ملاجی کا کشمیر۔ کشمیر کے بڑے دل میں کھلے ہوئے نیلوفر کے پھول، ہیں جو طوفان کی دھمک محسوس کرتے ہوئے چونک اُٹھتے ہیں، اور طوفان کی لہروں پر ڈول رہے ہیں اور پھل سنبھل کر گرد و پیش کا جائزہ لے رہے ہیں اور سُرخ پروں والے شکارے تیزی سے پانی کی سطح کو چیرتے ہوئے نشاط باغ کی طرف بڑھ رہے ہیں اور مانجھی چپو چلاتے ہوئے گا رہے ہیں۔

حسن و جمال کا شمیر۔
دلکش شوخ و دلپذیر۔
اپنا وطن ہے بے نظیر
پیارے وطن کے دوستو!
سرکش و کامراں رہو
باغِ نشاط کے گلو
شاد رہو جواں رہو

اخباری جوتشی

جب سے ہندوستانی راجاؤں کو پنشن ملی ہے۔ راج جوتشیوں اور ناچنے والیوں کا بھاؤ مندا پڑ گیا ہے۔ لیکن اس سے پہلے ناچنے والیوں اور بالخصوص راج جوتشیوں کی ریاستوں میں بڑی پوچھ گچھ تھی۔ راجا لوگ انھیں سر آنکھوں پر بٹھاتے تھے اور ریشمی چلمن کی اوٹ سے مہارانیاں انھیں اپنے ہاتھ دکھاتی تھیں۔ وہ نرم و نازک ہاتھ جن کی مخروطی انگلیوں پر نیلم، پکھراج یا زمرد اور لعل بدخشاں چمکتے تھے۔ ایک دفعہ بچپن میں میں نے بھی اپنا ہاتھ ایک راج جوتشی کو دکھایا تھا۔ راج جوتشی نے میرا ہاتھ دیکھ کے کہا تھا "یہ بالک بڑا گیانی ہوگا" اور میں نے راج جوتشی کی موٹی توند، اسکی سلک کی اچکن اور سونے کے بٹن دیکھ کے سوچا تھا کہ بڑا ہو کے اگر میں گیانی ہوا تو اسی راج جوتشی کی طرح گیان دھیان حاصل کرونگا۔ ورنہ جینے کا کچھ مزہ نہیں ہے۔

اب میں ریلوے میں کلرک ہوں اور میرا سارا دھیان گیان اسی میں صرف ہوتا ہے

کہ کس طرح پرانی فائلوں کو چھ ماہ تک دبا کے رکھوں اور نئی فائلوں کو کھولنے سے انکار کر دوں۔ یہ بھی بڑا مشکل کام ہے اور میں اسے کرتا ہی رہتا لیکن اس سال تو مہنگائی نے بالکل کمر توڑ دی۔ چنانچہ میں ریلوے کی کلرکی چھوڑ کے اخبار "دیش بھگت" میں اخبار جوتشی کے عہدے پر ملازم ہو گیا۔ آج کل ہر بڑے روزنامے میں ایک جوتشی ہوتا ہے جو ہر ہفتے کو اخبار میں جوتش سے حساب لگا کے اپنے اخبار کے پڑھنے والوں کی قسمت کا اندازہ لگاتا ہے۔ اس سے پہلے کانگریسی اور سوشلسٹ اخباروں میں جوتشی نہیں ہوا کرتے تھے لیکن ۱۵ اگست کے بعد ان لوگوں کو بھی جوتشیوں کی ضرورت پڑ گئی۔ اسی سلسلے میں میں نے جب اخبار "دیش بھگت" کا اشتہار دیکھا تو میں نے عرضی داغ دی، جو منظور ہو گئی۔ شامت اعمال سے مجھے جوتش وغیرہ تو نہ آتا تھا۔ مگر سوچا کہ راج جوتشی نے کہا تھا کہ بیٹا بڑے ہو کے گیانی ہو گے، سو آج موقع ہاتھ آ ہی گیا۔ لگے ہاتھوں اس کام کو بھی کر ہی ڈالیں اور پھر ریلوے کی کلرکی کی دن بھر کی گھس گھس کے بعد ۴۰ روپئے ملتے ہیں۔ ان سے کیا ہوتا ہے۔ یہاں ہر ماہ ساڑھے تین سو ملیں گے اور کام کچھ بھی نہیں ہے۔ بس ہر ہفتے سات دن کا زائچہ تیار کر کے اخبار میں دے دینا ہے تاکہ پڑھنے والے اسے دیکھ کے آئندہ ہفتے کے لئے اپنی قسمت کا اندازہ لگا سکیں۔ بس یوں سمجھئے کہ ہر مہینے یہ چار زائچے اور ایک مہینے کے بعد پورے مہینے کا زائچہ خاص طور پر ان لوگوں کے لئے جو اس مہینے میں پیدا ہوئے ہوں میں نے پوچھا "اور کوئی کام۔"

چیف اڈیٹر بولے "پہلے ہم یہ دھندا نہیں کرتا تھا۔ صرف دیش کے لڑنے والے سیوکوں کی خبریں چھاپتا تھا۔ اب لڑنے والے نہیں رہے تو ہم لوگ کیا کریں ادھر "دیش سیوک" نے بڑا بھاری جوتشی رکھا ہے اس سے اخبار کی بکری دس ہزار بڑھ گئی ہے۔ اب آپ کا کام دیکھتے ہیں کہ "دیش بھگت" کے گاہک کتنے بڑھاتا ہے۔"

میں نے کہا آپ فکر نہ کیجئے۔ دوسرے ہفتے ہی سے پچاس ہزار کی اشاعت نہ ہو تو میرا نام پنڈت بھیکی رام وسوندھا نہیں کچھ اور رکھ دیجئے گا۔"

چیف اڈیٹر پنسل کے سرے پر لگا ہوا ربر چباتے ہوئے بولے "آپ ریس کا جوتش بھی جانتے ہیں؟"

میں نے گیلا اسفنج اٹھا کر اسے کھاتے ہوئے جواب دیا "جی ہاں مہاراجہ بدھشادا مرحوم کو میں ہی ٹپ نکال کے دیا کرتا تھا۔ اس کے علاوہ میں چاندی سونے لوہے، تیل اور روئی کی جوتش بھی جانتا ہوں۔"

چیف اڈیٹر نے جم کلب کھاتے ہوئے کہا "جب تو آپ ہمارے کمرشل صفحے کے لئے بھی کارآمد ہو سکتے ہیں۔"

"آپ کی عنایت ہے" میں نے خوش ہو کر سیاہی حلق میں انڈیلی اور ہونٹوں کو سیاہی چوس سے صاف کرتے ہوئے کہا۔

سینچر کا دن سر پر آگیا اور ابھی تک میں نے اپنی رپورٹ تیار کر کے پریس میں نہیں دی تھی۔ چیف اڈیٹر نے دو تین بار یاد دہانی کرائی۔ میں نے کہا "آپ اخبار روک کے رکھئے میں نے سخت محنت کر رہا ہوں۔ بس زائچہ تیار ہونے میں تھوڑی سی دیر ہے ابھی سب کچھ ہوا جاتا ہے۔ آپ دیکھئے گا ایسی عمدہ رپورٹ بناؤں گا کہ بڑے بڑے راسخ جوتشی منہ دیکھتے رہ جائیں گے۔ اس اثنا میں ادھر ادھر بہت گھوما اور دو ایک کتابیں بھی پڑھیں جوتش پر لیکن کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ آخر جیسے تیسے بھی بن سکا میں نے زائچہ تیار کر کے بھیج دیا اور کمرشل نوٹ بھی لکھا اور ریس کے لئے بھی ٹپ نکال کے بھیج دیئے آپ بھی ملاحظہ فرمائیے۔

کمرشل نوٹ

اس ہفتے میں بازار مندا رہے گا۔ تھوڑی سی گرانی ہوگی لیکن جلد اتر جائے گی۔ لوہا تانبے سے ٹکرائے گا۔ لیکن

پھر الگ ہو جائے گا، مونگ کی دال، آلو کی بھاجی اور پاپڑ کا بھاؤ تیز ہوگا لیکن پٹرول کا گیلن آدھا ہو جائے گا اور پھر ایک دم پھٹ جائے گا۔ جس سے بازار میں آگ لگنے کا اندیشہ ہے بیوپاریوں کو چاہیئے کہ اس موقع پر فائر انجن منگوا کر رکھیں۔

ٹاٹا ڈیفرڈ، ڈلیا بسکٹ، برلا ہندوستان نمبر ۱ اور بھائی ودھاوا سنگھ کے آچار شلغم کے حصے اونچے جائیں گے۔ چاندی سونے کے بھاؤ پر ملے گی اور سونا گندم کے بھاؤ پر۔ اور گندم کسی بھاؤ پر بھی دستیاب نہ ہوگی، یہہ سارا ہفتہ اسی طرح جائے گا اور ممکن ہے کہ سارا سال اسی طرح جائے لیکن فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ سرکار اپنی ہے اور ہندوستان کا ستارا اس وقت مشتری کے گھر میں ہے۔ جس کا اختری فیض آبادی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

روئی کا بھاؤ گر جائے گا۔ کپڑا مہنگا ہو جائے گا۔ گنے کا بھاؤ سستا ہو جائیگا لیکن کھانڈ مہنگی ہو جائے گی۔ اس ہفتے جو بیوپاری سفید چیز کا بیوپار کرے گا اسے بڑا فائدہ ہوگا، چاہے وہ سفید لٹھا بلیک مارکیٹ میں فروخت کرے یا پرتا کا سفید ہاتھی پالے ہر صورت میں فائدہ ہی فائدہ ہے۔ اس ہفتے کے چھ دنوں میں کارخانوں میں ہڑتال رہے گی۔ ساتواں دن اتوار کا ہوگا۔ جبس روز چھٹی ہوتی ہے۔ لیکن اس سے گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اسٹاک ایکسچینج کے باہر گھومنے والے سانڈ دن کی پوجا کرنے سے اور ان کے منہ میں تمباکو والا پان ڈالنے سے یہہ سنکٹ جاتا رہے گا

ریس کے ٹپ
از
ریس کا رسیا

اس ہفتے کا لکی دن پانچواں ہے اس لئے آنکھ بند کر کے پانچویں ریس

کھیلئے۔ اس میں پانچویں نمبر کے گھوڑے پر اپنی ساری جائداد لگا دیجئے۔

تیسری اور آٹھویں ریس بالکل نہ کھیلئے۔ سب گھوڑے اور سب جاکی نکمے ہیں اور گھوڑوں کے مالک ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہیں۔ پبلک کو اُلو بنائیں گے اور لاکھوں روپیہ لوٹ لیں گے۔

چوتھی ریس میں گوالیار اور کشمیر دوڑ رہے ہیں لیکن یہ کامیاب نہیں ہو سکتے۔ جیت سیٹھ گھوندو لال کے گھوڑے "شامی" کی ہوگی اور اگر شامی نہ جیتا تو "حرامی" تو ضرور جیتے گا۔ دونوں کھیلئے ون اور پلیس

پہلی اور دوسری ریس کے گھوڑے اچھے ہیں۔ کوئی کسی دوسرے کو ہرا نہیں سکتا۔ آپ کوئی سا گھوڑا کھیل دیجئے جیت جائے گا۔ اور اگر نہ جیتے تو ایک ریوالور اپنے پاس رکھئے۔ پہلی فرصت میں لبلبی دبا کر خودکشی کیجئے۔

چھٹی ریس میں "ہندوستان" اور "پاکستان" بہت اچھے گھوڑے ہیں بہتر یہ ہوگا کہ ہندو "ہندوستان" کھیلیں اور مسلمان "پاکستان" لیکن یہ دونوں گھوڑے آنے والے نہیں ہیں۔ اس ریس میں ساتویں نمبر کا جو گھوڑا دوڑ رہا ہے اس کا نام ہے ماؤنٹ بیٹن۔ بس یہی گھوڑا آخر میں جیتے گا اس جیت سے پہلے ریس کورس میں ہندو مسلم فساد بھی ہو سکتا ہے۔

ساتویں ریس میں ۹ نمبر کا گھوڑا سب سے اچھا ہے۔ لیکن ۱۱ نمبر بھی بُرا نہیں۔ آخری فرلانگ تک یہ دونوں گھوڑے برابر چلے آئیں گے۔ لیکن آخر میں وہی گھوڑا جیتے گا۔ جس کے مالک نے اسے زیادہ شراب پلائی ہوگی۔ کس گھوڑے نے زیادہ شراب پی ہے۔ اس کا اندازہ اصطبل کے لوگوں ہی سے ہو سکتا ہے۔ جوتشی آپ کو اس کیا بتا سکتا ہے؟

نویں ریس میں سب گھوڑیاں دوڑ رہی ہیں ان کے نام فلم اسٹاروں کے سے

ہیں۔ نرگس۔ ثریا، نورجہاں، حفیظ جہاں، حسنہ بانو بورہ ہوا ئی حالانکہ موخرالذکر ایک ایکٹرس کا نام ہے لیکن گھوڑے کے مالک نے اُسے بھی شاید کسی ہیروئن کا نام سمجھ کے اپنی گھوڑی کا نام رکھ دیا ہے۔ خیر اس سے ہماری جوتش میں کچھ فرق نہیں پڑتا۔

اس ریس میں چندر ریکھا گھوڑی جیتے گی کیونکہ یہ ابھی ابھی سرکس سے آئی ہے؛

اس ہفتے آپ کی کُنڈلی کیا کہتی ہے

سوموار:۔ آپ دیر میں بستر سے اُٹھیں گے۔ سر میں ہلکا ہلکا درد بھی محسوس ہوگا۔ جو اسپرو کھانے سے جاتا رہے گا۔ دن اچھا گزرے گا۔ دفتر میں ہیڈ کلرک سے لڑائی ہوگی لیکن فرم کا مالک آپ کی طرفداری کرے گا۔ شام کے چھ بجے آپ ضرور کوئی خوش خبری سنیں گے۔

منگل وار:۔ کوئی گم شدہ خزانہ ملے گا۔ بیوی سے لڑائی ہوگی۔ میٹنی شو میں آپ ایک خوبصورت لڑکی دیکھیں گے۔ جس کے ساتھ اس کا خاوند ہوگا اور آپ اس سے کوئی بات نہیں کرسکیں گے اور کلیجہ پکڑ کے رہ جائیں گے۔ رات کو گھر لوٹتے ہوئے ٹرام کا کنڈکٹر آپ کی بے عزتی کرے گا۔ صبح چائے کے ساتھ آلو کی بھجیا ملے گی۔ رات کو فاقہ ہوگا۔ مگر بیچ کا دن کا وقت بڑے مزے میں بسر ہوگا۔

بدھ وار:۔ آپ کا چیک Dishonour ہوگا۔ پولیس حراست میں رکھے گی۔ شام کو آپ کی بیوی کا بھائی ضمانت دے کے چھڑا کے لائیگا۔ یہ بہت برا دن ہے۔ آپ کے لئے لیکن رات بہت اچھی گذرے گی، گھر میں کھانا بھی اچھا ملے گا۔ سر میں تیل کی مالش بھی ہوگی۔ اس روز اگر آپ گھر سے باہر نہ نکلیں تو

اچھا ہے ورنہ آپ کی مرضی ۔

جمعرات:۔ راج دربار میں عزت ہوگی۔ کوئی نیا محبوب ملے گا۔ دوپہر کے وقت آپ بازار میں تاش لینے کے لئے جائیں گے اور پھر کسی موٹر کے نیچے آکے مر جائیں گے۔

جمعہ:۔ جمعرات کو اگر آپ نہیں مرے تو جمعہ کی صبح کو ناشتے پر آپ تیتر کے کباب کھائیں گے۔ اور اگر آپ سبزی خور ہیں تو مونگ کی دال کے کوفتے، اخبار میں آپ ضرور کوئی خبر پڑھیں گے جسے پڑھ کر آپ کو بڑا صدمہ ہوگا جو ایک پیگ برانڈی سے دور ہو جائے گا۔ اس روز آپ کے چھوٹے بچے کی ٹانگ ٹوٹ جائے گی ورنہ دن بھر اچھا گزرے گا۔ آپ کی بیوی ایک نئی ساڑی کا تقاضہ کرے گی۔

سنیچر:۔ آپ صبح راشن لینے جائیں گے لیکن دوکان بند ملے گی۔ کپڑے کے کوپن لینے جائیں گے لیکن دفتر بند ہوگا۔ ریس کھیلنے جائیں گے اور بہت سا روپیہ ہار کے آئیں گے۔ تھرڈ کلاس کا ٹکٹ خرید کر فرسٹ میں بیٹھیں گے اور ٹکٹ چیکر آپ کا چالان کر دے گا۔ لیکن آپ پیسے ادا کرکے چھوٹ جائیں گے۔ اس روز ہمسایوں سے لڑائی کا خطرہ ہے۔ لیکن ہاتھ جوڑ دینے سے یہ خطرہ جاتا رہے گا۔ بزنس میں ترقی۔ دل کھول کے سٹہ کھیلئے اور بلیک مارکیٹ کیجئے۔ بہرحال بلیک مارکیٹ کے لئے بہت اچھا ہے۔

اتوار:۔ آپ کو اچانک دفتر میں بلا لیا جائے گا اور آپ کی چھٹی کے سارے پروگرام ختم ہو جائیں گے۔ آپ دفتر میں سڑیں گے اور گھر پر بیوی بچے آپ کو گالیاں دے رہے ہوں گے۔ شام کو آپ گھر جاتے ہوئے بچوں کے لئے دو کیلے دو امرود اور ایک سنگترہ ضرور خریدیں گے۔ اور کوئی منچلا آپ کی جیب کترے گا۔

لیکن جو لوگ اتوار کے روز پیدا ہوئے ہوں ان کے لئے یہ دن بہت اچھا ہے۔ وہ سو سال تک جئیں گے۔ جس میں پہلے پچاس برس گھر میں اور دفتر میں بسر ہوں گے اور اگلے پچاس برس پاگل خانے میں .....!

دیش بھگت کا پرچہ جب اتوار کے روز بازار میں آیا تو دس منٹ میں سب بک گیا۔ ایک کاپی بھی نہ رہی۔ دوسرے دن اخبار کے دفتر کے باہر اخبار پڑھنے والوں کا جمِ غفیر جمع تھا۔ وہ لوگ دفتر کو آگ لگانے کی کوشش کر رہے تھے لیکن پولیس کی مدد سے حالات پر قابو پا لیا گیا۔ چیف اڈیٹر اور دوسرے لوگوں نے مل کر میری ٹھکائی کی۔ چنانچہ یہ مضمون میں آپ کو ہسپتال سے لکھ کے روانہ کر رہا ہوں۔ آپ سمجھتے ہوں گے کہ میرا جوتش غلط نکلا اس لئے میرا یہ حال ہوا۔ نہیں صاحب یہ بات نہیں ہے۔ میرا جوتش سو فیصدی سچ نکلا۔ اتنا سچ کہ لوگ اسے برداشت نہ کر سکے۔ لوگ اخباری جوتشی کے پاس سچائی ڈھونڈنے نہیں جاتے۔ اپنے جھوٹے خواب دیکھنے جاتے ہیں یہی میری غلطی تھی۔

حصہ ۴۸

صاحب

"صاحب! یہ میں کیا سنتا ہوں کہ اس ملک میں کھانے کی کمی ہے۔ لوگوں کو خوراک نہیں ملتی۔ بہت جھوٹ ہے۔ افترا ہے۔ بہتان ہے اور کسی کمیونسٹ کا گڑھا ہوا ہے ورنہ صاحب دراصل اس ملک میں کھانے کی کوئی کمی نہیں ہے۔ یہاں ہر قسم کی خوراک ملتی ہے۔ اب مجھی کو دیکھئے، میں مرغ، بیٹر، تیتر، بلاؤ، قورمہ، کباب ہر چیز کھاتا ہوں، ہر روز کھاتا ہوں اور بڑے مزے سے کھاتا ہوں۔ صبح و شام میرے دسترخوان پر انواع و اقسام کی سبزیاں ترکاریاں چنی ہوتی ہیں اور ابھی پرسوں کی بات ہے۔ میں وزیر غذا کے یہاں مدعو تھا۔ وہاں پر کم سے کم دس قسم کے کھانے میز پر سجے ہوئے تھے اور ہر قسم کے پھل موجود تھے۔ اتنے بڑے بڑے سنہری سنگترے میں نے کہیں نہیں دیکھے۔ ہمارے ناگپور کے سنگترے تو ان کے سامنے بالکل حبشی معلوم ہوتے ہیں۔ وزیر غذا سے پوچھنے پر پتہ چلا کہ یہ سنگترے خاص طور پر کیلیفورنیا امریکہ سے منگائے گئے ہیں اور ان کی قیمت فی سنگترہ تین مارشل ڈالر ہے۔ کیلیفورنیا کی دو چیزیں بہت مشہور ہیں۔ ایک تو سنگترے دوسری ہالی وڈ کی ایکٹریسیں۔ ابھی تو صرف سنگترے آتے ہیں۔ لیکن جب مارشل پلان ہندوستان میں نافذ ہوگا تو ہالی وڈ کی ایکٹریسیں بھی آئیں گی اور ملک کی صنعت و حرفت کو بہت فروغ حاصل ہوگا۔

"خیر بات غذا کی ہو رہی تھی میں کہاں سے کہاں پہونچ گیا۔ اس دن کا ذکر ہے، میں گورنمنٹ ہاؤس میں مدعو تھا۔ وہاں پر بھی میں نے کھانے پینے کی کمی

نہیں دیکھی۔ کئی دفعہ اپنے دوست رکن چھور داس کے یہاں مجلس ہوئی۔ سبھی لوگ کھاتے پیتے خوش وخرم نظر آئے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اخباروں میں ہر روز یہ خبر کیسے نظر آتی ہے کہ ملک میں غذائی بحران ہے۔ صاحب! میں سچ عرض کرتا ہوں ملک میں غذائی بحران کہیں نہیں ہے اور اگر کہیں ہے تو کمیونسٹوں کا پیدا کیا ہوا ہے آپ ان کے گولی مار دیجئے غذائی بحران خودبخود جاتا رہے گا۔ یہ کمیونسٹ بڑے بدمعاش ہوتے ہیں صاحب۔ میں آپ کو اپنی مثال بتاتا ہوں ایک دفعہ اتفاق ایسا ہوا کہ میں نے اپنے ڈرائیور کو تین مہینے تک تنخواہ نہیں دی محض اتفاق ہوگیا۔ ورنہ میں اپنے ملازموں کا خود بہت خیال رکھتا ہوں۔ تو صاحب! وہ بہت چیں چپڑ کرنے لگا، میں نے جب اسے اچھی طرح ڈانٹا تو وہ دوسرے روز لال باوٹے والوں کو اپنے ساتھ لے آیا۔ اور آس پاس کی کوٹھیوں میں شور مچ گیا کہ سیٹھ کوٹھی والے صاحب نے تین مہینے کی تنخواہ اپنے ڈرائیور کی مارلی ہے۔ صاحب! ان لال باوٹے والوں نے اس ڈرائیور کو تین مہینے کی تنخواہ دلوائی اور ایک ماہ کا بونس الگ دلوایا۔ ایسی اوندھی کھوپڑی کے لوگ ہیں یہ۔ ان کو ہماری سرکار جتنی جلدی تڑی پار کردے اچھا ہے ہم نے سوراج اس لئے نہیں لیا تھا کہ ڈرائیوروں کو بونس دیتے پھریں اور مزدوروں کو مہنگائی دیں۔ ایسے ہم ان غریب آدمیوں کو منھ لگانے لگیں تو حکومت ہو چکی۔

"ہاں بھئی دوسرا پیگ بنا دو، مگر ذرا بڑا بنانا۔ جانے کیوں آج برانڈی میں مزا نہیں آرہا ہے، اور یہ مکھن میں تلے ہوئے سبز مٹر، اور آلو کے قتلے بھی کیوں راکھ کے بنے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ ہوٹل والوں نے اپنا خانساماں بدل دیا ہے شاید؟ کیوں میاں وہ پرانا خانساماں کہاں چلا گیا؟ ساٹھ روپئے تنخواہ مانگتا تھا؟ باپ رے! ارے میاں یہ لوگ تو ماٹھ کیا سنو میں بھی خوش نہیں

ہوں گے۔ آجکل تو زمانے کی ہوا ہی ایسی ہے۔ جسے دیکھو سر پر چڑھا آرہا ہے کہتا ہے مہنگائی دو، گزر بسر کی اجرت دو۔ ارے بھئی اب ساٹھ مانگتے ہو۔ پہلے کیسے سات میں گزر کرتے تھے؟ میں کہتا ہوں آگ لگ رہی ہے زمانے کو۔ چین میں دیکھو کیا ہو رہا ہے۔ ملایا میں کیا ہو رہا ہے۔ برما میں کیا ہو رہا ہے؟ یہ ہماری حکومت کیوں سوئی پڑی ہے؟ چین میں فوجیں کیوں نہیں بھیجتی؟ کیا ہوا ہے اسکو؟ ارے بھئی میں نے تو اپنی بیوی کے جواہرات سوئٹزرلینڈ بھیج دیئے ہیں۔ تم نے کہاں بھیجے ہیں؟ جنوبی امریکہ؟ ہاں بھئی ہاں میں نے بھی سنا ہے کہ برازیل آجکل بہت ہی محفوظ جگہ ہے۔ وہاں آجکل کوئی کمیونسٹ دم نہیں مار سکتا۔ مگر یار ادھر آؤ۔ قریب آؤ ایک بات کان میں کہتا ہوں۔ تم نے کہاں بھیجے ہیں؟ جنوبی امریکہ؟ ہاں بھئی میں نے بھی سنا ہے کہ برازیل آجکل بہت ہی محفوظ جگہ ہے۔ وہاں آجکل کوئی کمیونسٹ دم نہیں مار سکتا۔ مگر یار ادھر آؤ۔ قریب آؤ۔ ایک بات کان میں کہتا ہوں۔ کوئی بھروسہ نہیں ہے ان لوگوں کا کیا معلوم کسی روز وہاں بھی اٹھ کھڑے ہوں۔ ڈرائیور لوگ وہاں بھی تو ہوتے ہوں گے۔ ہاں مزدور بھی ہوں گے۔ بس یہ لوگ پھر وہاں بھی پہونچ جائیں گے۔

"ہاں بھئی میں غذا کی بات کر رہا تھا۔ ہندوستان میں غذا کی کمی ہے۔ ارے میاں! یہ تو سونے کی چڑیا ہے سونے کی چڑیا۔ یہاں کی تو مٹی بھی سونا اگلتی ہے۔ ایک روز ہمارے بھنگی کو کوڑے کے ڈھیر میں سے سونے کا آویزہ ملا۔ ایک روز میں نے دیکھا کہ بھنگی کی بیوی نے میری بیوی کا آویزہ پہن رکھا ہے۔ ہمارے بھنگی کی بیوی بڑی خوبصورت ہے۔ دیکھو تو لٹو ہو جاؤ۔ ایک روز آؤ نا! تمہیں درشن کرائیں گے۔ ہی۔ ہی۔ ہی۔ ہی ..... میں نے اس سے پوچھا" تو نے یہ آویزہ کہاں سے لیا؟" بولی" میرے خاوند نے

دیا ہے" میں نے بھنگی سے پوچھا لوہ بولا مجھے کوڑے میں ملا تھا" لو۔ یہ ہے ہندوستان کی مٹی۔ میں تمہیں اپنی مثال بتاتا ہوں، ایک دفعہ میں جب بہت چھوٹا تھا، میں نے بھنگی کے بیٹے یعنی یہ جواب ہمارا بھنگی ہے اس کے ساتھ کھیلتے ہوئے کوڑے کے ڈھیر کو ٹٹولنا شروع کیا تو اس میں سے ہمیں چار آنے کے پیسے ملے دو سنگترے، ایک امرود اور ایک کتاب کا ورق جس کا نام تھا "آرائش حسن" اور ایک زنانہ سلیپر کا جوڑا جس سے بدبو میں اماں نے مجھے پیٹا۔ ایک کیک کا ٹکڑا جس کے ساتھ مکھن لگا ہوا تھا۔ بہت سارا پلاؤ اور گوشت اور چار چھ روٹیاں اب یہ تو ایک کوٹھی کے کوڑے کرکٹ کے ڈھیر کا حال ہے۔ اب ذرا گن جاؤ آس پاس کی میونسپلٹیوں کوٹھیاں، یہ غریب لوگ جو ان ڈھیروں کو ٹٹولتے ہیں۔ مزہ اڑاتے ہیں مزہ۔ کلکتے بمبئی اور دوسرے بڑے بڑے شہروں میں ایسے لاکھوں کروڑوں ڈھیر لگے ہوتے ہیں جن سے لاکھوں کروڑوں آدمی فائدہ اٹھاتے ہیں اور ہمیں تمہیں اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ حالانکہ ہمارے ہی گھروں سے سب چیز جاتی ہیں۔ میں تو کہتا ہوں کہ سرکار ہماری ان کوڑا کرکٹ چننے والوں پر ٹیکس لگا دے تو کیسا رہے؟ لاؤ ہاتھ میرے یار! کیسی بات کہی ہے اسی بات پر سرکار کو ہمیں وزیر بنا دینا چاہیئے کروڑوں روپے کی آمدنی کروں اسی ایک ٹیکس سے۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں۔ یہ لوگ دراصل کوڑے کرکٹ کے ڈھیر سے خوراک نہیں ڈھونڈھتے۔ یہ اور دوسری چیزیں ڈھونڈتے ہیں۔ یہ سب کمیونسٹوں کی چالبازی ہے میں سب جانتا ہوں ان سب لوگوں پر ٹیکس لگا دینا چاہیئے۔ کیا خیال ہے۔ میں حکومت کو خط لکھوں۔ ؟

یہ خوراک پیدا کرنے کا سوال ہی حکومت کو یوں ہی پریشان کر رہا ہے ورنہ ہندوستان میں کیا نہیں ہوتا۔ گیہوں ہوتا ہے باجرہ ہوتا ہے مکئی ہوتی ہے

گنا ہوتا ہے۔ روئی ہوتی ہے۔ پٹ سن ہوتا ہے۔ گلاب کا پھول ہوتا ہے۔ انڈا ہوتا ہے اور مرغ کی ٹانگ ہوتی ہے۔ جس کا جواب دُنیا میں کہیں نہیں ہے۔ کیوں! سچ کہنا۔ مرغ کی ٹانگ کا جواب دُنیا میں ہے؟ سچ کہنا دوست کیا مزے کی بات کہی ہے! اور یہ لوگ غذا اُگانے کا رونا رو رہے ہیں۔ ارے بھئی میں تمہیں اپنی مثال بتاتا ہوں۔ میرے پاس چار درجن سے زیادہ فلٹ کی ٹوپیاں ہوں گی۔ اور ایک ٹوپی کی باری دوسرے تیسرے مہینے کہیں جاکے آتی ہے اب ایک روز میں [illegible] رنگ کی امریکن ٹوپی پہننے لگا۔ کیونکہ میں اس کے ساتھ کا امریکن سوٹ پہن رہا تھا کہ میں کیا دیکھتا ہوں ٹوپی کے اُوپر ایک خوبصورت پی فلاور اُگا ہوا ہے! ہیں! یہ کیسے ہوا؟ دیکھا تو ٹوپی کے اوپر ایک ذرا سا مٹی کا ٹکڑا پڑا ہوا ہے۔ کہیں رستے میں گر گیا ہوگا۔ کہیں سے اُسے مٹی بھی مل گئی ہوگی۔ اب یہ اس ذرا سی مٹی سے پھول اُگ آیا۔ تو جناب یہ ہے ہندوستان کی مٹی! میں سوچتا ہوں کہ اگر ہر ہندوستانی اپنی ٹوپی پر خوراک اُگانا شروع کردے تو کیسا رہے! ٹوپی کی بالائی سطح ۵۲ مربع انچ ہے اور ہندوستان میں تیس پینتیس کروڑ آدمی تو بستے ہی ہوں گے۔ اب حساب لگاؤ تم میں کہتا ہوں۔ اگر ہندوستان کے سارے آدمی صرف اپنی ٹوپیوں پر فصل اُگانا شروع کردیں تو کبھی قحط نہیں پڑ سکتا۔ کیا کہتے ہو۔ ننگے سر والے لوگ کیا کریں؟ ارے بھئی ان کے سروں پر بھی قانوناً ٹوپیاں بلکہ چھوٹی چھوٹی مٹی کی ٹوکریاں رکھ دی جائیں اور اس کام کے لئے گاندھی ٹوپی تو بہت موزوں رہے گی کیا خیال ہے؟ میرے خیال میں یہ ہندوستان کا سب سے بڑا پروجکٹ بن سکتا ہے۔ ٹوپی پروجکٹ! میرے خیال میں اسے کامیاب بنانے کے لئے امریکہ سے ماہر سائنسداں، ماہر انجینئر اور ماہر بینکروں کی مدد مانگی جائے۔ اور

اس کام کی ابتدا ابھی کیبنٹ کے اراکین سے ہوتا کہ کچھ عرصہ کے بعد معلوم ہو کہ یہ جو اپنے سر پر دھان کی فصل اگائے چلے آرہے ہیں یہ جے رام داس دولت رام ہیں اور یہ جن کے سر پر گندم کے خوشے لہرا رہے ہیں یہ جان متھائی ہیں، اور یہ جن کے سر کے اوپر مونگ کی دال اُگی ہوئی ہے یہ سردار پٹیل ہیں ۔ ہقو سر کا کھیت پنڈت نہرو کا ہے اور جن کے سر کے اوپر گوبھی کے پھول اُگے ہوئے ہیں ۔ وہ مولانا ابوالکلام آزاد ہیں ! ہا ہا ہا ! کیسا لطف رہے گیا دماغ کام کر رہا ہے میرا اس وقت ۔ ذرا ایک peg اور پیک دینا ۔ اصلی فرنچ برانڈی پی کے میرا دماغ کام کرتا ہے ۔ جانے Prohibition کے بعد کیا ہوگا ۔ خیر یار تو جب بھی پئیں گے ۔ یہاں نہیں پئیں گے تو گوا جا کے پئیں گے ۔ میں نے تو اپنا بینک اکاؤنٹ بھی گوا بھیج دیا ہے جانے یہاں کل کلاں کو کیا ہو جائے ۔ کون کسی کا اعتبار کرے ۔ آں ۔ تم بھی ایسا کرو ۔ میرے یار ۔ بس دو چار لاکھ یہاں رہنے دو باقی باہر بھیج دو ۔

" اچھا بھیا ایک بات اور سنو ۔ اپنے یہاں جو کہتے ہیں کہ غذا کا قحط ہے تو یہ لوگ کتے ، چوہے ، بلیاں کیوں نہیں کھاتے ؟ ارے بھئی دوسرے کئی مشرقی ملکوں میں تو لوگ انھیں بڑی رغبت سے کھاتے ہیں ۔ کتے بلیاں تو کیا وہ لوگ تو سانپوں تک کو اُبال کے کھا جاتے ہیں ۔ یہاں کیوں نہیں کھاتے یہ لوگ ؟ یہاں تو کتے بلیاں چوہے اتنی تعداد میں ہیں کہ کیا بتاؤں خود میری کوٹھی میں اتنی تعداد میں ہیں کہ ان سے ایک اچھا خاصا چینی رستوران کھل سکتا ہے ۔ مگر کسی میں اتنی عقل ہی نہیں کہ اِن غریب آدمیوں سے یہ چیزیں کھانے کو کہے ۔ خواہ مخواہ سرہفتے راشن میں گیہوں اور باجرہ اور چاول دے کر ان لوگوں کا دماغ خراب کر رہے ہیں ۔ میں تو سمجھتا ہوں ، راشن ایک سرے

سے بند کر دینا چاہیئے۔ جب جا کے یہ لوگ کہیں سیدھے ہوں گے۔ ارے میں نہیں اپنی مثال بتاتا ہوں۔ میں جب پیرس میں تھا تو مجھے ایک کنیڈین کمانڈر نے بتایا کہ ایک دفعہ وہ ایسے علاقہ میں چلے گئے کہ انھیں دو ہفتے گھاس ابال کے کھانی پڑی اور وہ لوگ گھاس ہی اُبال کے کھاتے رہے اور بالکل ٹھیک عین مین تندرست رہے۔ اب بتاؤ۔ اگر جنگ کے دوران میں کینیڈا کے یورپین لوگ گھاس کھا سکتے ہیں تو قحط کے دوران میں ہندوستان کے لوگ گھاس کیوں نہیں کھاتے؟

کیا کہا! بیجا پور میں لوگ گھاس ہی کھا رہے ہیں۔ گجرات میں بھی ٹھیک ہے۔ ان احمقوں کے ساتھ ایسا ہی سلوک ہونا چاہیئے۔ کورے احمق ہیں یہ لوگ۔ کیا کہا تو نے؟ احمق نہ ہوتے تو کوڑے کے ڈھیر میں غذا کیوں ڈھونڈھتے؟ سوراج میں آزادی کیوں دیکھتے؟ اور اطلانٹک چارٹر میں امن کیوں تلاش کرتے۔ اور سرمایہ دار سے مجرّت کی اُمید کیوں رکھتے.....؟ کون ہے تو جو ہم دو شریف آدمیوں کے بیچ میں بولتا ہے؟ ارے تو اس ہوٹل کا بیرا ہے! یہاں ہمارے پاس کھڑے ہو کے ہماری باتیں سنتا ہے؟ تو بھی مجھے کمیونسٹ معلوم ہوتا ہے۔ میں ابھی منیجر سے تیری رپورٹ کرتا ہوں.......... " نہیں نہیں یار اب میں اور نہیں پیوں گا۔ اس سالی سے نشہ ہی نہیں ہو رہا!" ؞

مُورتیاں

وہ میری گوڈارڈ کی ایک تصویر دیکھ کے واپس آرہا تھا، جو شہوانی جذبات سے معمور تھی۔ ہالی وُڈ کی تصویریں اب کیسی بے جان اور نکمّی ہوتی جارہی ہیں اس نے سوچا، جب سے نامریکی کمیٹی نے ہالی وُڈ کے اچھے اچھے ڈائرکیٹروں اور افسانہ نگاروں، مکالمہ نویسوں اور ایکٹروں کو اشتراکیت کے الزام میں دھر کے انھیں فلم انڈسٹری سے باہر نکال دیا ہے، تب سے تو تصاویر کا معیار اور بھی پست اور غلیظ ہوگیا ہے۔ پہلے تو پھر بھی ایک آدھ اچھی تصویر آجاتی تھی۔ لیکن اب..... اب اسی تصویر کو لے لیجئے میری گوڈارڈ کی عمر چالیس برس ہے ٹھیک ہے ہندوستانی ہیروئن کے مقابلہ میں میری گوڈارڈ نے اپنے حسن کو بہت حد تک وقت کی دستبرد سے بچا کے رکھا ہے۔ ہندوستانی ہیروئن دونوں ہاتھوں سے اپنا حسن لٹاتی ہے۔ ہالی وڈ کی ہیروئن دونوں ہاتھوں سے اُسے سمیٹتی ہے سنبھالتی ہے۔ لیکن وقت کے داؤں سے کوئی کب تک بچ سکتا ہے۔ اب میری گوڈارڈ ہی کو لے لیجئے چالیس برس کے بعد بھی کمبخت حسین معلوم ہوتی ہے لیکن اتنی ہی حسین جتنی ایک چالیس برس کی عورت حسین معلوم ہوسکتی ہے۔ اس کے ہونٹوں کے کنارے، اس کی آنکھوں کے گوشے اس کی گردن کی لکیریں، اس کے شانوں کے نیچے ڈھلکا ہوا گوشت صاف صاف اس کی عمر کی داستان بتا رہا ہے گو اس داستان کو خوبصورت کپڑوں

اور دلکش چال میں چھپانے کی بے حد کوشش کی گئی ہے۔ لیکن یہ فریب کامیاب نہیں ہے۔ مذاق سلیم پر گراں گزرتا ہے۔ اُس نے سوچا مذاق سلیم پر آجکل ہر شام گراں گزرتی ہے۔ نہ کوئی تصویر اچھی آتی ہے نہ کہیں کوئی مجلس ہوتی ہے، ہوٹلوں، سینماؤں اور لکچر گھروں کے پروگرام اتنے فرسودہ ہوتے جا رہے ہیں کہ اُسے اس بازاری کلچر سے گھن آنے لگی ہے۔ اب وہ کہاں جائے، کیا کرے۔ کبھی کبھار تو اس کی زندگی میں تفریح کرنے کا لمحہ آتا ہے اور وہ اسے بھی اچھے ڈھنگ سے صرف نہیں کر سکتا۔ یہی سوچتا سوچتا وہ تھرڈ کلاس کا ٹکٹ لے کے لوکل گاڑی کے ایک کونے میں کھڑکی کے پاس بیٹھ گیا۔ کھڑکی کے سامنے دور کسی بلڈنگ پر جہاں نیان روشنی میں لکھا تھا جانی واکر" جانی واکر اور میری گوڈرڈ اس نے سوچا" یہ ہے موجودہ نظام زندگی کا ماحصل، اور وہ سوچتا ہے... ..... کبھی انسان اتنا بلند ہمت ہوگا کہ وہ سارے نظام عالم پر اپنی مہر ثبت کر سکے گا..... وہ چاند تک پہونچے گا۔ مریخ کی سیر کرے گا..... زہرہ کی فضاؤں میں اقبال کے ترانے گونجیں گے، مشتری کی سرزمین پر شیکسپیر اور کالی داس کے ڈرامے کھیلے جائیں گے۔ انسان اور اس کا عجوب تخیل عمل کی راہ سے چلتا ہوا، نئے ستاروں کو پھاندتا جائے گا۔ میری گوڈرڈ اور جانی واکر" اس زندگی میں یہ کیسے ممکن ہے..... .

دو لڑکے اس کے سامنے آکے بیٹھ گئے۔ وہ آپس میں بڑے انہماک سے گفتگو میں مصروف تھے۔ بحث کہیں پہلے ہی سے چھڑی ہوئی تھی اور اب گاڑی میں آکر بھی جاری رہی۔

ایک لڑکے نے جس کی آنکھوں پر عینک تھی اور جس کے سامنے کے دو دانت باقی دانتوں سے چھوٹے تھے، دوسرے لڑکے سے کہا" ہم سے فیس

پہلے ہی نہیں دی جاتی تھی، اب کہاں سے دیں گے۔ ایک تو میڈیکل کالج کی کتابیں اسقدر مہنگی ہیں۔ پچیس روپیہ سے کم میں تو کوئی کتاب آتی نہیں ادھر سے فیس بڑھ گئی ہے۔ اپنی تو آفت ہے۔"

دوسرے لڑکے نے بھی عینک پہن رکھی تھی، اس کی مضبوط ٹھوڑی ذرا آگے کو بڑھی ہوئی تھی، جس سے ہونٹ ذرا اندر کو چلے گئے تھے، اس کے پہرے کا عجب، نمایاں ہوگیا تھا۔ یہ پہلے لڑکے سے کم عمر تھا اس لئے زیادہ بے فکری سے اور بلند لہجے میں بات کرتا تھا۔ اس نے بڑے متین آمیز لہجے میں جواب دیا" اشتراکیت کے سوا کوئی حل نہیں ہے۔"

پہلے لڑکے نے کہا۔" ہمیں اشتراکیت سے کیا لینا ہمیں تو ڈاکٹر ہونا ہے اک دن۔"

دوسرا بولا" کچھ بھی بن جاؤ تم۔ میرا عقیدہ ہے کہ اب زندگی کی گاڑی اشتراکیت کے بغیر آگے نہیں چل سکتی۔"

وہ ان دونوں لڑکوں کی گفتگو میں دلچسپی لینے لگا اور ذرا سا آگے جھک گیا۔ بڑے لڑکے کے دل میں شبہہ پیدا ہوا۔ اس نے دوسرے لڑکے سے آہستہ سے کہا۔" آہستہ بات کرو۔ ممکن ہے یہاں سی۔ آئی ڈی کے لوگ بیٹھے ہوں۔" اتنا کہہ کے اس نے سامنے کی سیٹ کی طرف اشارہ کیا۔ دونوں لڑکوں نے اسے سر سے پاؤں تک گھورا اور وہ پھر پیچھے کو ہٹ گیا اور اپنی سیٹ سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ وہ دونوں لڑکے اسے ابھی تک گھور رہے تھے۔ اس نے بھی انھیں گھورنا شروع کر دیا۔ دوسرے لڑکے نے مسکرا کر پہلے سے کہا نمعلوم کیا کہا۔ وہ سن نہیں سکا۔ بڑا لڑکا ہنسنے لگا اور کھڑکی کے باہر اشارہ کرنے لگا۔ جہاں دور فضا میں نیان روشنی میں ایک بہت بڑا

پارکر کا قلم چمک رہا تھا۔

دوسرے لڑکے نے اس قوی ہیکل پارکر کے قلم کو دیکھتے ہوئے کہا "میرا جی چاہتا ہے۔ اس قلم سے فضا میں موٹے موٹے حرفوں میں لکھ دوں" اشتراکیت "ششش" بڑے لڑکے نے اسے یاد دلایا کہ احتیاط ضروری ہے۔

دوسرا لڑکا غصّہ میں آ کے پھر مخالف سیٹ کو گھورنے لگا۔ اور اس نے لڑکے کی نظریں اپنے چہرے پر پڑتی دیکھ کر اپنا منہ پھیر لیا اور پھر کھڑکی کی سلاخوں سے رخسار لگا کر اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ وہ اکثر ایسا کیا کرتا تھا۔ جب گاڑی حرکت میں آتی تھی تو گاڑی کے پہیوں کی رفتار اس کے رخساروں کے اندر موسیقی کی لرزش بن جاتی تھی اور اسے بڑا سرور حاصل ہوتا تھا۔ اسے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ تھرڈ کلاس کے ڈبّہ میں نہیں بیٹھا ہوا ہے۔ کسی کھلی گاڑی میں بیٹھا ہوا تاروں بھرے آسمان کے نیچے کسی اکیلی سڑک پر اُڑتا چلا جا رہا ہے اور ہوا کے ٹھنڈے ٹھنڈے جھونکے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیر رہے ہیں اور چاندنی اس کے گالوں کو اپنی نرم نرم صباحت سے تھپتھپا رہی ہے اور پہیوں کی رفتار کی تال اس کے رخساروں کے اندر لرزشیں پیدا کرتی ہوئی اس کے کانوں سے گزرتی ہوئی اس کے دماغ میں رقص کے ہیولے تخلیق کر رہی ہے اور وہ اسی دُنیا کی سیر کرتا کرتا سو جاتا حتیٰ کہ گاڑی کا آخری اسٹیشن آ جاتا اور گارڈ آ کے اُسے جگاتا:۔

"اٹھو اُٹھ بیٹھو۔ اب گاڑی آگے نہیں جائے گی"۔

لیکن آج ابھی اس نے مشکل سے آنکھیں بند کی تھیں کہ کسی نے اُسے ہوکا دے کے جگا لیا۔ یہ ایک سفید ریش سانولے رنگ کا بڈھا آدمی تھا۔ جس نے بھورے رنگ کا ایک میلا سوٹ پہن رکھا تھا۔ اس نے سبز رنگ کی میلی کچیلی

بے حد گھسی ہوئی ٹائی پہن رکھی تھی اور اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا تھیلا تھا۔
"بڈھے نے بڑی لجاجت سے کہا" مجھے تھوڑی سی جگہ دے دو۔ میں یہاں بیٹھ جاؤں گا۔"
"یہاں جگہ کہاں ہے؟ پہلے ہی سے تین آدمی بیٹھے ہیں تم تو خود دیکھ رہے ہو۔"
بڈھے نے پھر کہا" تھوڑی سی جگہ دے دو۔ میں سکڑ کر بیٹھ جاؤں گا۔ اور آپ لوگوں کو بڑی اچھی اچھی تصویریں دکھاؤں گا۔"
یہ کہکر اس بڈھے نے آس پاس کے لوگوں کی طرف دیکھا۔ دو تین آدمی ایک دم بول اٹھے" ہاں! ہاں!! یہاں آجاؤ۔ یہاں آجاؤ۔"
خیر بڈھا اسی کے پاس بیٹھ گیا اور تھکن کا ایک لمبا سا سانس لیا اور پھر اپنے تھیلے کو اپنی گود میں لے کر بولا۔" بڑی مہربانی ہے آپ کی" اور وہ اپنے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اپنا تھیلا کھولنے لگا۔ تھیلا کھولتے کھولتے اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ اس نے تھیلے میں سے کاغذوں کی ایک پوٹلی نکالی جس پر ایک رسّی بندھی ہوئی تھی۔ بڈھا وہ رسّی کھولتے کھولتے کہنے لگا۔" بڑی اچھی تصویریں ہیں یہ۔ تیس سال سے یہ تصویریں میرے پاس ہیں۔"
اس نے کاغذوں کے پھونسڑے الگ کئے اور اس میں سے ایک مورت نکالی" یہ نرسنگھ بھگوان ہیں" بڈھے نے کہا" یہ ظالموں کا کلیجہ چیر کے اُن کا لہو پی جاتے ہیں۔ دیکھئے۔"
لکڑی کے چوکھٹے میں چاندی کی تصویر تھی۔ چاندی کے اوپر سنہری پالش کی ہوئی تھی۔ لکڑی چندن کی تھی۔ کبھی وہ بھی سنہرے رنگ کی ہوگی۔ لیکن اب متواتر استعمال سے وہ بھی سیاہ ہو چکی تھی، لیکن اس میں سے ابھی تک خوشبو آتی تھی۔

بڈھے نے کہا " اس میں اب چندن کی خوشبو نہیں ہے ۔ یہ پوجا کی سالگرہ کی خوشبو ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ دوسری تصویر دیکھئے "۔

دوسری تصویر کالی ماتا کی تھی ۔

بڈھے نے کہا " یہ بھی ظالموں کو سزا دیتی ہے ۔ دیکھئے اس کے بیشمار ہاتھوں میں ظالم انسانوں کی کھوپڑیاں لٹک رہی ہیں ۔ کالی ماتا ان ظالموں کی گردنوں سے لہو پیتی ہے ۔ اور کھوپریوں کا ہار بنا کے اپنے گلے میں ڈال لیتی ہے ۔ یہ دیکھئے کالی ماتا "۔

ایک مارواری سیٹھ بڑے غور سے اُس مورت کو دیکھنے لگا ۔ کُل پانچ مورتیں تھیں ، ان میں ایک تو رادھا کرشن کی مورت تھی ، ایک رام چندر جی کی مورت تھی ۔ اور ایک شیو جی مہاراج تھے ۔ بڈھا ہر مورت کو کاغذوں کے پلندے سے نکال کے اپنے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے صاف کرتا اور پھر انھیں دیکھنے والوں کے ہاتھوں میں دے دیتا ۔

ایک گجراتی منیم نے کہا " بڑی سُندر مورتیاں ہیں ۔ یہ چاندی کی ہیں شاید "

پہلے لڑکے نے کہا " انسانی جسم کی مصوری کتنی صحیح ہے ۔ دیکھو "۔

بڈھے نے کہا " یہ تو میں نہیں جانتا کہ یہ مورتیاں چاندی کی ہیں ، یا جست کی ۔ یہ خوبصورت ہیں کہ نہیں ۔ میں نے تو انھیں اپنی پوجا کے لئے لیا تھا "۔

مارواڑی سیٹھ نے بڈھے کی طرف غور سے دیکھا اور کہا " اس ایک مورتی کی کیا قیمت ہوگی ؟"

بڈھے نے کہا " اس کی قیمت ؟ اس کی قیمت کیا ہوگی ۔ میں نے تیس سال تک ان کی پوجا کی ہے ۔ ان کی قیمت کیا ہوگی چھوڑیئے یہ بات "۔

دوسرے لڑکے نے کہا کوئی اور مورت دکھایئے ۔ یہ تو واقعی بہت

اچھی ہے"۔

بڈھے نے کہا "نہیں میرے پاس یہی پانچ مورتیں رہ گئی ہیں۔ پہلے کوئی پچاس کے قریب ہونگی۔ اب صرف پانچ رہ گئی ہیں۔ میں نے آج سے تیس سال پہلے، یہ مورتیں بڑے چاؤ سے منگوائی تھیں۔ یہ مورتیاں بنگلور میں ملتی ہیں اتنا خوبصورت کام کہیں نہیں ہوتا۔ میرے پاس سب بڑے بڑے دیوتاؤں اور دیویوں کی مورتیاں تھیں، اب صرف یہ پانچ باقی رہ گئی ہیں"۔

گجراتی نے کہا "تو جب آپ انھیں بیچتے ہیں، تو دام بتانے میں کیا ہرج ہے؟"

بڈھے نے کہا"........ میں انہیں بیچتا نہیں ہوں۔ میں یہاں آنے سے پہلے کراچی میں ایڈوکیٹ تھا، وہاں اچھی خاصی گزر ہو جاتی تھی میری پریکٹس اور بھی زیادہ چل سکتی تھی۔ لیکن مجھے شروع ہی سے پوجا پاٹ، دھیان گیان کا شوق رہا ہے۔ میرے گھر ہر روز کیرتن ہوتا تھا اور میرے گھر میں سارے دیوتا پوجے جاتے تھے' ایسی ایسی پچاس مورتیاں میرے پاس تھیں اور مجھے ان کی پوجا کرنے میں بڑا آنند ملتا تھا۔ میرا گھر پریوار بڑا سکھی تھا۔ میری بیوی مجھ سے بڑی محبت کرتی تھی۔ میرے بچے بالے، گھر میں پرماتما کی دیا سے سب کچھ موجود تھا۔ سکھر کے قریب ایک گاؤں میں میں نے زمین بھی لے لی تھی۔ اور وہیں اپنا مکان تعمیر کرکے میں نے اپنی پریکٹس کو خیرباد کہدیا۔ اور دن رات اپنے دیوتاؤں کے چرنوں میں رہنے لگا"۔

بڈھا ایک لمحے کے لئے رک گیا۔

"پھر ملک تقسیم ہوگیا اور مجھے اپنا گھر چھوڑنا پڑا۔ چلتے وقت میرے گھر پر حملہ کرنے والوں نے مجھ سے کہا کہ یا تو میں اپنی مورتیاں ساتھ لے جاؤں یا میں اپنی مورتیاں چھوڑ جاؤں، اور باقی گھر کا ساز و سامان اپنے ساتھ لے جاؤں۔

وہ دونوں میں سے صرف ایک چیز لے جانے کی اجازت دیتے تھے۔ میں نے اپنی مورتیاں اٹھائیں اور باقی سامان وہیں چھوڑ کر اپنی بیوی بچوں سمیت گھر سے باہر آگیا۔ میری بیوی نے مجھے بہت سمجھایا۔ لیکن میں نے کسی کی نہیں سنی۔ خیر ہم لوگ سکھر سے کراچی اور کراچی سے جہاز میں بیٹھ کر ہندوستان پہونچ گئے۔ دوسرے سندھی شرنارتھی اپنے ساتھ بہت سارا ساز و سامان لے آئے ہیں لیکن میں یہی پچاس مورتیاں اپنے ساتھ لایا۔ اور اب میرے پاس صرف یہ پانچ مورتیاں رہ گئی ہیں۔

"باقی کہاں گئیں؟" گاڑی میں بیٹھی ہوئی ایک بوڑھی عورت نے اس سے پوچھا۔

بڈھے نے کہا "جب ہم کراچی سے یہاں آئے تو خیال تھا کہ ہیں یہاں آکے پھر پریکٹس شروع کر دوں گا۔ کوئی نہ کوئی کام مل جائے گا۔ سرکار کوئی نہ کوئی کام ہم دکھیاروں کے لئے نکالے گی۔ مگر ڈیڑھ سال سے ہم ریفیوجی کیمپ میں پڑے ہیں۔ نہ کوئی کمرہ ملتا ہے نہ کام۔ اب میں بڈھا آدمی ہوں میری عمر اب بھگتی بھاؤ میں مگن رہنے کی ہے۔ نہ کہ کام کرنے کی..... طاقت مجھ میں ہے نہیں۔ پھر بھی سوچا تھا کہ یہاں پریکٹس شروع کر دوں گا۔ جوان ہوتا تو ٹرکوں پر پتھر بھی کوٹ سکتا تھا۔ اب کیا کام کر سکتا ہوں۔ یہاں آکے بیوی بیمار پڑ گئی اس کی طویل بیماری میں میں نے دس مورتیاں بیچ ڈالیں۔ میں انھیں بیچنا نہیں چاہتا تھا۔ لیکن میں نے انھیں مجبور ہو کے بیچا۔ میری بیوی مر گئی۔ میری دو لڑکیاں بھی مر گئیں۔ میرا بڑا لڑکا بھی مر گیا اور میں نے ایک ایک کر کے باقی مورتیاں بھی بیچ ڈالیں۔ اب میرے پاس صرف یہ پانچ مورتیاں رہ گئی ہیں۔ جب میں انھیں بھی بیچ ڈالوں گا تو پھر میرے پاس کچھ نہ رہے گا۔ پھر میں آرام سے مر جاؤں گا۔"

بڈھے کی آواز کانپ رہی تھی۔ گاڑی میں سناٹا تھا۔

مارواڑی سیٹھ نے کہا "یہ کالی ماتا کی مورتی مجھے دیدو۔ یہ مجھے بہت پسند ہے۔"

بڈھے نے کہا "یہ نہیں۔ یہ نہیں۔ اور جو چاہے لیلو۔ یہ..... یہ..... میں سب سے آخر میں بیچوں گا۔"

مارواڑی بولا "اچھا تو شیو جی مہاراج دیدو۔"

بڈھے نے شیو جی مہاراج کی مورتی نکالی۔ اُسے بڑی حسرت کی نگاہوں سے تاکتے ہوئے بولا "یہ لیجاؤ۔ نہیں۔ میں اسے بھی نہیں دوں گا۔ ابھی نہیں دوں گا۔ میں کالی ماتا نہیں دوں گا۔ اور شیو جی مہاراج نہیں دوں گا اور نرسنگھ بھگوان بھی نہیں دوں گا۔ یہ سب ظالموں کو مارنے والے ہیں۔ میں انھیں سب سے آخر میں بیچوں گا۔ سب سے آخر میں۔"

گجراتی نے کہا "تو رادھا کرشن مجھے دیدو۔"

"بڈھا بولا" اچھا..... لیلو۔"

"کتنے پیسے دوں؟"

"جو جی میں آئے دے دو۔ ان کی کوئی قیمت نہیں ہے۔ صرف شردھا کی قیمت ہے۔"

گجراتی نے بڈھے کی گود میں پانچ کا نوٹ رکھ دیا۔ مرہٹی عورت نے شری رام کی مورتی کے لئے تین روپئے دھر دیئے۔ بڈھے نے آخر بار شری رام کی مورتی کی طرف دیکھا۔ رادھا اور کرشن کی مورتی کی طرف دیکھا اور پھر کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اس نے ان مورتیوں کو ان کے نئے گاہکوں کے حوالے کر دیا۔

گاڑی چلتی رہی۔ نوٹ بڈھے کی گود میں پڑے تھے۔ لیکن وہ بار بار انھیں

موتیوں کو دیکھتا تھا، جو دوسرے لوگوں کے پاس چلی گئی تھیں اس کے ہونٹ کانپنے لگے۔ پھر اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے اور اس نے اپنا سر پیٹ لیا اور ڈوبتے ہوئے گلے سے بولا "تم بھی چلے گئے! تم بھی چلے گئے! میرے کرشن میرے رام!..."

وہ مرہٹی عورت کہنے لگی "تمہیں دکھ ہوتا ہے تو اپنی موتی واپس لے لو۔"

"بڈھا بولا" ہاں ہاں، مجھے واپس دیدو۔ یہ لو اپنے روپئے اور تم بھائی ——" وہ گجراتی سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔ "تم بھی میری مورتی مجھے واپس کر دو۔ بھگوان کے لئے۔ دیکھو میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتا ہوں"

گجراتی نے بھی بڈھے کی مورتی واپس کر دی۔ بڈھے نے اسے روپئے واپس کر دئیے گاڑی میں پھر سناٹا چھا گیا۔

بڈھا آنسو پونچھ کے اپنی جگہ سے اٹھا اور گاڑی کے کھلے دروازے کے بیچ میں استادہ آہنی ڈنڈے کا سہارا لیکر کھڑا ہو گیا۔ گاڑی تیزی سے آگے نکلی جا رہی تھی۔ وہ جبتے منزل سے آگے آ چکی تھی اور اب اسے دادر سے پہلے کسی اسٹیشن پر نہیں ٹھہرنا تھا۔ گاڑی کے پہیئے بڑی تیزی سے حرکت کر رہے تھے اور کھڑکی کی سلاخوں پر رکھے ہوئے اس کے رخسار کے اندر لرزشوں کے دائرے بن رہے تھے اور ان دائروں کے اندر سنگیت کی لہریں ابل رہی تھیں اور وہ ان لہروں کے نقرئی جھاگ پر پھسلتا ہوا کہکشاں کی دودھیا وادی میں تیرتا چلا گیا کہ یکایک اسے اک زور کا جھٹکا لگا، اور اس کی آنکھوں کے سامنے رنگا رنگ کے تارے ناچ گئے اور یکایک اسے معلوم ہوا کہ وہ اپنی سیٹ پر بیٹھا ہے اور گاڑی رکی ہے اور چاروں طرف شور برپا ہے۔

"کیا ہوا؟" اس نے میڈیکل کالج کے لڑکوں سے پوچھا۔

"بڈھے نے گاڑی سے چھلانگ لگا دی!" گجراتی بولا۔

وہ گاڑی سے اُتر کر لائن کے کنارے کنارے چلا گیا۔ جدھر بڈھے کی لاش
ی تھی۔ اس کے گھٹنے کٹ گئے تھے اور ایک بازو۔ اور اس کی مورتیاں ریزہ ریزہ
کے اس کے چاروں طرف بکھری ہوئی تھیں۔ رادھا الگ پڑی تھیں، کرشن
۔، رام کا تاج ان کے سر سے جدا تھا اور جہاں بڈھے کا سر تھا وہاں
ی ماتا اپنا منھ کھولے لال لال لہو چاٹ رہی تھیں اور اس منظر کے گرد بہت
رے لوگ جمع تھے۔

کسی نے کہا "سندھی شرنارتھی تھا۔ مورتیاں بیچتا تھا۔"

"بیچ بیچ بیچارہ!" کسی نے کہا۔

اور اس نے سوچا چلو اچھا ہوا بڈھا مر گیا۔ پچھلا زمانہ تو ختم ہوا جب لوگ
م اور کرشن کی مورتیاں بیچتے تھے۔ اب یہ زمانہ بھی ختم ہو جائے گا۔ جب
ے قلم ایکٹریسوں اور لیڈروں کی تصویریں بیچتے ہیں۔ پھر اس انسان
زمانہ آئے گا جب وہ نہ اپنا دھرم بیچے گا۔ نہ اپنی بیٹی کا حسن۔ نہ اپنے
ہیرو کی عزت ....

وہ پلٹ کر اپنے ڈبے کے اندر چڑھ گیا۔ کالج کے لڑکوں نے سندھی
رنارتھی کے موضوع کی شہ پاکر پھر اسٹرا کیت پر بحث شروع کر دی تھی۔
لیکن اسے اندر آتے دیکھ کر وہ پھر چپ ہو گئے۔

اس نے چھوٹے لڑکے سے کہا "نڈر ہو کے بات کرو۔ خیالی تصویریں بیچنا
د کرو۔ جاؤ ساری دُنیا کی فضا پہ اپنے قلم سے بڑے بڑے حرفوں میں لکھ دو
شتراکیت...... اب تمہیں کوئی روکنے والا نہیں ہے؟"

سیٹھ جی

سیٹھ جی کے ہونٹ بڑے بڑے موٹے اور شہوانی تھے، انکی ناک لمبی اور ٹیڑھی
، اور آنکھوں میں شائیلاک کی سی مکاری جھلک رہی تھی۔ میں جب اُنکے دفتر میں پہونچا،
وہ فوراً اپنی کرسی سے اُٹھ کھڑے ہوئے، اور بڑے تپاک سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہنے
گے۔ "ابا ہا! آپ آئے ہیں! ارے بھائی کشن جی آئے ہیں، ایک کرسی اندر بھیج دو۔"
ایک چپراسی کرسی لے کر آیا، میں اس پر بیٹھ گیا۔ میں نے سیٹھ جی کے مسکراتے
ہوئے چمکتے ہوئے چہرے کی طرف دیکھا، ایسا معلوم ہوتا تھا کسی نے اُن کے چہرے
پر بناسپتی گھی کا ڈبہ انڈیل دیا ہے، یہ مسکراہٹ اُسی نقلی گھی میں تلی ہوئی معلوم
ہوتی تھی۔ سیٹھ جی نے اپنے پیلے پیلے دانت نکالے، اپنے ہاتھ ملے اور ایک عجیب منحنی
ایک سی ہنسی سے جو کسی شیطان گھوڑی کی ہنہناہٹ سے مشابہت رکھتی تھی، کام
لیتے ہوئے بولے "ارے واہ واہ! دھن بھاگ ہمارے! کشن جی آگئے ہیں۔ میں
نے ہرچند بھائی سے کہا تھا کہ کشن جی کبھی ملیں تو ہمارے پاس بھیج دینا ارے بھائی
اور دو لاکھ کی بات ہی کیا ہے یہ گرہ تو جب چاہو پوری کر لینا ہم نے تم نے تو
کبھی چھوڑ دیا۔"
میں نے کہا "میں آج سے چھ ماہ پہلے اسی کام کے لئے آپ کے پاس حاضر ہوا
تھا۔ آپ نے اتنے پھیرے کرائے کہ میرے جوتے کے اندر کا موزہ بھی گھس گیا۔"
"ہاہاہا" سیٹھ صاحب ہنستے ہوئے بولے "آپ بڑے کھُس مجاک معلوم ہوتے

ہیں۔ جوتے کے اندر کا موجا بھی گھس گیا ہا ہا ہا! ایسا مذاق تو ہم نے کسی فلم میں نہیں
اس کو لکھ ڈالنا کسی فلم میں۔ تمہاری قسم سے بہت چلے گا ہا ہا ہا!"
ہنستے ہنستے سیٹھ جی کی آنکھیں بند ہو گئیں اور ان کے پیٹ میں لرزشیں پیدا
ہونے لگیں۔ جب اچھی طرح ہنس چکے تو گھنٹی بجا کے بولے "کچھ پیو گے، کوئی ٹھنڈا
ڈنڈا؟"

"ہاں ٹھنڈے سوڈے میں وسکی ڈال کے پیوں گا"۔
اس کے بعد آپ نے پھر ہنسنا شروع کر دیا۔ ایک لڑکا گھنٹی کی آواز سن کر آ
آیا۔ اور اپنے موٹے سیٹھ کی توند میں ہنسی کی لہریں اٹھتی دیکھ کر مودب کھڑا ہو گیا۔ جب
یہ طوفان رکا تو سیٹھ نے لڑکے سے کہا "دو بہت اچھی وہسکی کی بوتلیں لاؤ"۔ جب
چلا گیا تو آپ میری طرف آگے جھک کے میری طرف دیکھنے لگے "میں چاہتا ہوں کہ آپ
روپیہ مجھ سے مواد کی بجائے ڈھائی لاکھ لے لیں لیکن پکچر ایسی ہو جو بالکل کلاسکل ہو"
میں نے کہا "کلاسکل سے آپ کا مطلب کلاسکل میوزک سے ہے شاید
بہت اچھا۔ میں دلیپ چندر بیدی سے عرض کروں گا کہ وہ اس کا میوزک سنبھالیں"۔

"نہیں نہیں" سیٹھ جی بولے "آپ میرا مطلب غلط سمجھے۔ آپ ایک ایسی
پکچر بنائیں جو کلاسیکل ہو، یعنی جس کا جواب دنیا میں نہ ہو۔ آپ سمجھ گئے نا میرا مطلب؟
ایک دم فائن۔ سمجھے!"
"سمجھ گیا" میں نے کہا "مگر ایسی پکچر ہندوستان میں دیکھے گا کون؟ دیکھئے
اس سے پہلے تین چار تجربے ہم لوگ کر چکے ہیں۔ ایک تو وہ قحط بنگال کے بارے میں تصویر
تھی، ملک اور ملک سے باہر کے بڑے بڑے مشاہیر نے یہ تصویر دیکھی اور اس کی بڑی
تعریف کی۔ اور روس اور امریکہ اور انگلینڈ کے فلمی ناقدوں نے بھی اسے بہت سراہا

لیکن یہاں کہیں بھی تین چار ہفتے سے زیادہ نہیں چلی۔ آپ ایسی ہی تصویر چاہتے نا؟"

"نہیں نہیں۔ ایسا پکچر کیا کرنا اپنے کو!"

میں نے کہا" تو پھر ایک پکچر وہ تھی جس میں غریبی اور امیری کا تضاد بڑی خوبصورتی سے دکھایا گیا تھا، اداکاروں نے بہت خوبصورت طریقے سے اپنا کام سرانجام دیا تھا۔ ڈائرکٹر نے بھی بڑی کاوش سے وہ تصویر بنائی تھی۔ بنی ہندوستان میں تھی لیکن جب فرانس میں اس کی نمائش کی گئی تو وہاں کے فلمی مبصروں نے اسے اس سال کی بہترین فلم قرار دیا۔ مگر ہندوستان میں ابھی تک وہ ڈبوں میں بند ہے اگر آپ چاہیں تو میں ــــــ"

"باپ رے! یہ میں نے ایسی پکچر کے لئے کب کہا ہے۔ آپ سے ہیں تو کچھ اور ــــــ"

میں نے کہا۔" تو پھر شاید آپ وہ تیسری پکچر چاہتے ہیں جس میں گانے اور ڈانس بھی عوام کے مذاق کے تھے۔ لیکن اس کی کہانی ریاستی جاگیرداروں کے خلاف تھی۔ جس کی وجہ سے کئی ریاستوں میں اس کی نمائش خلاف قانون دی گئی اور ڈسٹری بیوٹر آج تک بنانے والے کی جان کو رو رہے ہیں۔ مگر پکچر اچھی خاصی تھی۔ بیچارے ریاستی عوام کی زندگی کی عکاسی ......"

سیٹھ گھبرا کے بولے" اپنے کو آکاسی پاسی کچھ نہیں چاہئے۔ اپنے کو تو ایک سیدھی سادی پکچر"۔

میں نے بات کاٹ کے کہا" تو ایک وہ پکچر ہے۔ بڑی سیدھی سادی محبت کی کہانی ہے۔ مگر اس کا موضوع تھا۔ زمین کسانوں میں بانٹ دو۔ پکچر تین دفعہ سنسر ہوئی۔ آخر میں نہ زمین کسانوں کے پاس رہی نہ کسان رہے۔ خالی خولی محبت کی کہانی رہ گئی۔ شہد لگا کر چاٹنے کے لئے۔"

سیٹھ بولے نابابا، میں باز آیا۔ ایسی فلم اپنے کونا ہیں چاہیئے۔ جب تو ایک کوڑی نہیں دوں گا۔ میں تو ایسی کلاسکل پکچر چاہتا ہوں جیسی کھڑکی، سنتوشی شہنائی"!

میں نے کہا "کھڑکی اور شہنائی تو فلمیں ہیں لیکن سنتوشی کوئی فلم نہیں ہے وہ تو کھڑکی اور شہنائی کے ڈائریکٹر صاحب کا نام ہے"۔

"ہا ہا ہا" سیٹھ صاحب ہنستے ہوئے بولے" دیکھئے کشن جی! ناموں میں کیسے گڑ بڑ ہوجاتی ہے؟" پھر وہ ایک دم چونک کے بولے "مگر سنتوشی نام بھی تو بُرا نہیں فلم کا نام سنتوشی رکھ دیں! کیسا رہے گا؟"

"نام تو بہت اچھا ہے مگر سنتوشی صاحب آپ پر دس لاکھ کے ہر جانے کا ڈگری کردیں گے"۔

"اچھا جی"! سیٹھ صاحب کرسی پر تلملائے، تڑپے اور پھر ایک دم ٹھس ہوکر بیٹھ گئے۔ جیسے ان کے سامنے ساری دُنیا میں اندھیرا چھا گیا ہو۔

میں نے کہا" سنتوشی تو نہیں لیکن بے ہوشی نام کیسا رہے گا؟"

سیٹھ کرسی سے اچھل پڑے اور بڑے زور سے ہاتھ ملاتے ہوئے بولے۔

"واہ واہ کشن جی! کیا نام سوچا ہے۔ بے ہوشی! بڑا اچھا نام ہے"۔

میں نے کہا" اور اس میں جتنے کیریکٹر ہیں سب بے ہوش ہوتے جاتے ہیں ہیرو، ہیروئن، ولن، سائڈ ہیروئن، سنیاسی، سائڈ ہیرو، سائڈ ولن سب لوگ ایک ایک گانا گاتے ہیں اور گاتے ہی بیہوش ہوتے جاتے ہیں کیسا idea ہے سیٹھ؟"

"کمال کردیا کشن جی! مگر کتنے گانے رکھوگے آپ؟"

"تیس گانے رکھوں گا۔ کیریکٹر بہت ہونگے نا۔ اور پھر ہر گانے کے بعد

بے ہوشی ہوگی۔ گویا ہر دفعہ نیا ڈرامہ پیدا ہوگا۔ میں تو سمجھتا ہوں سیٹھ پکچر لگتے ہی ہال میں ساری پبلک بے ہوش ہو جائے گی"۔

" واہ واہ!" سیٹھ جی خوشی سے ہاتھ ملتے ہوئے بولے " نیا ڈرامہ ہے اکدم نیا! میں ابھی اوپیرا ہاؤس بک کرتا ہوں اس کے لئے"

میں نے کہا " ہاؤس تو بہت اچھا ہے۔ مگر پبلک کی بیہوشی کے لئے ذرا چھوٹا رہے گا۔ کوئی بڑا سا ہال لیجئے اور وہاں سے کرسیاں ہٹوا دیجئے۔ تاکہ لوگ پکچر دیکھتے جائیں اور اس فرشِ خاک پر بیہوش ہوتے جائیں۔ دیکھئے گا سیٹھ جی! کیسی باکس آفس پکچر بنتی ہے۔ لائیے ابھی چیک کاٹ دیجئے"۔

" چیک تو دیتا ہوں۔ مگر اس میں میرا شیئر بھی رہے گا، پکچر بھی گروی رکھوں گا اور سود اور رائلٹی بھی لوں گا"۔

میں نے کہا " سب منظور ہے"۔

وہ بولے " ایک اور شرط ہے۔ اس پکچر میں میرا شیئر ہے اس لئے میں نہیں چاہتا کہ پکچر کے بیچ میں کوئی شرارت ہو۔ ہمارا نام بدنام ہو"۔

" وہ کیسے ہوگا؟" میں نے پوچھا۔

" بس یہی کہ اسٹوڈیو کے اندر کوئی شراب نہیں پئے گا۔ کوئی سگرٹ نہیں پئے گا۔ کوئی لڑکیوں کی طرف بری نظر سے نہیں دیکھے گا"۔

میں نے کہا " وہ تو سب ٹھیک ہے، مجھے منظور ہے۔ مگر یہ شراب کے لئے ذرا اتنی مشکل ہے کہ اگر میرے خیال میں کوئی ایک آدھ پیگ پی کے آجائے تو اسے کیسے روک سکتے ہیں۔ ایک آدھ پیگ تو ڈاکٹر بھی زبردستی پلا دیتے ہیں بیمار لوگوں کو"

سیٹھ نے کہا " ارے ایک آدھ پیگ کی بات کیا ہے وہ تو ٹھیک ہے

خیر میں چک لکھتا ہوں"۔

وہ چک لکھنے لگے میں نے ذرا وقفہ کے بعد کھنکھار کے کہا" اور سگرٹ سے تو خود مجھے وحشت ہوتی ہے، یعنی ہر وقت منہ سے تمباکو کی بو آتی ہے جیسے آج آپ کے منہ سے پیاز کی بو آرہی ہے، اور......"

سیٹھ جی ایک دم چونک کے بولے" کیا میرے منہ سے پیاز کی بو آرہی ہے؟"

" بو نہیں بھپارے آرہے ہیں"۔

سیٹھ جی نے غصہ میں گھنٹی بجائی، چپڑاسی آیا، سیٹھ جی نے چپڑاسی سے کلونت کو بلانے کو کہا۔ کلونت آیا تو سیٹھ اس پر برس پڑے" بدمعاش، سالے! تو نے بتایا نہیں۔ آج سالن میں اتنی بھنی ہوئی پیاز تھی کہ منہ سے بو آنے لگی۔ سالے! تجھے معلوم نہیں! دس سال سے ہمارے یہاں کام کر رہا ہے اور تجھے یہ معلوم نہیں کہ میں برنچ میں کبھی پیاز نہیں کھاتا ہوں۔ کیسا جنگلی کے مافق گدھا ہے، نکل جا، ابھی جا۔ منیم جی سے حساب چکتا کرالے"۔

بلونت سر جھکائے چلا گیا۔

میں نے کہا" بات پیاز کی نہیں سگرٹوں کی ہو رہی تھی، دراصل سگریٹ پینا بہت بری بات ہے، لیکن کبھی کبھی اسٹوڈیو میں جب آدمی رات دن کام کرتا ہے تو ایک اعصابی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے، اس کے لئے کبھی کبھار سگرٹ پینا بہت مفید ہوتا ہے"۔

سیٹھ نے کہا نہیں نہیں، میں ایسے سگرٹ پینے کو تھوڑا ہی منع کرتا ہوں"۔

" باقی رہی لڑکیوں والی بات" میں نے کہا" اس پر تو ظاہر ہے کسی

شریف آدمی کو کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ لڑکیوں کو بُری نظروں سے دیکھنا بہت بُرا ہے۔ مگر آپ جانتے ہیں۔ سچّی محبت کو کوئی نہیں روک سکتا۔ جہاں عورت اور مرد ملیں گے وہاں سچّی محبت بھی ہو گی۔ جسے آجتک انڈسٹری میں ہزاروں بڑے بڑے جغادری قسم کے پروڈیوسر لوگوں سے یکے معمولی اکسٹرا لوگوں تک کو ہو چکی ہے۔ ایسے لوگ بھی ہیں جنھوں نے دو دو شادیوں کے بعد سچّی محبت کی ہے۔ اب اس چیز کو روکنا تو بہت مشکل ہوگا۔"

سیٹھ جی بولے "سچّی محبت کو میں کب بولتا ہوں کہ منع کر دو۔ اپن خود ایک بار اس جھنجھٹ میں پھنس گئے تھے۔"

میں نے آنکھ مار کے کہا "سچ مچ سیٹھ جی، آپ بھی! یقین نہیں آتا۔"

"کسم لے لو کرن جی تمہارے ہی سر کی قسم، جو جھوٹ بولوں۔ وہ (ہائے میں مر گئی) پھلم کی ہیروئن، نہیں، رام تمہارا بھلا کرے، ہیروئن نہیں سائڈ میں کون تھی لڑکی؟"

"جوگیشوری؟"

"ہاں ہاں جوگیشوری سے ہمارا پریم ہو گیا۔ بڑھتے بڑھتے دو تین بچے بھی ہو گئے۔ اب وہ کولابے میں ہے میں اس کو خرچہ پانی سب دیتا ہوں۔ کبھی کبھی کولابے جاتا ہوں، تو کسم لے لو۔ بالکل اپنی دھرم پتنی کی طرح لگتی ہے۔ اب ایسے پریم کی کون منا ہی کرتا ہے ..... ؟ میں یہ تھوڑے ہی کہتا ہوں۔ کہ بالکل کمیونسٹ ہو جاؤ۔"

"ہاں ہاں وہ تو ظاہر ہے" میں نے کہا "آپ کا یہ مطلب تھوڑے ہی ہو سکتا ہے۔"

سیٹھ جی چک انگلیوں میں پھراتے ہوئے بولے "کرن جی! یہ میں کیا

سُن رہا ہوں۔ کمیونسٹ چین کو لے گئے"!

"ہاں لے گئے"۔

"اور ادھر ملایا میں بھی ان کی بدماسی ہے"؟

"سُنتے تو یہی ہیں"۔

آج صبح میں نے کھبر پڑھی کہ رنگون سے دس میل اُدھر لڑائی ہو رہی ہے۔ وہاں بھی یہ دنگا چل رہا ہے، ٹھیک ہے کیا"؟

میں نے کہا "آپ نے ٹھیک پڑھا ہے"۔

سیٹھ جی چیک انگلیوں میں گھماتے ہوئے رک گئے، انھوں نے غور سے چیک کی طرف دیکھا، میری طرف دیکھا، چیک کی طرف دیکھا۔ میرے اور چیک کے درمیان صرف ۶ انچ کا فاصلہ تھا۔ سیٹھ جی نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور آہستہ سے چیک کو پھاڑتے ہوئے بولے "کسن جی، اب ہمارا بیوپار نہیں چلے گا۔ اب یہ سودا کرنے کا وقت نہیں ہے"۔

کشمیر کو سلام

یہ بات کہ کشمیر جنت نظیر ہے مجھے اس وقت تک نہیں معلوم ہوئی جب تک میں اس جنت سے باہر نکالا نہیں گیا۔ میرا مطلب یہ ہے کہ میں چونکہ بچپن ہی سے کشمیر میں رہتا بستا چلا آیا تھا، اس لئے میرے لئے کشمیر کے مرغزاروں کی خوبصورتی، اس کی وادیوں کی دل کشی، اس کی جھیلوں کی رعنائی اور اس کے پہاڑوں کی بھین اور ملہنی کوئی اچنبھے کی بات نہیں تھی، میں سمجھتا تھا شائد ساری دنیا میں اسی طرح کی خوبصورتی ہوتی ہوگی ایسے حسین مناظر ہر جگہ پائے جاتے ہوں گے ہر جگہ ڈوبتا ہوا سورج اسی طرح جھیل کی نیلاہٹوں میں سونا رون ہوگا۔ اسی طرح شبنمی دھندلکوں میں کسی انجان گھاٹی پر لاکھوں رنگ رنگ کے پھول کھل جاتے ہوں گے، پہاڑ کے تناور درختوں کا جھنڈ اسی طرح کسی خاموش پراسرار درّے پر کھڑا ایک سلسلۂ کوہ سے دوسرے سلسلہ ہائے کوہ کو دیکھتا ہوا شہد کے چھتوں میں کام کرتی ہوئی شہد کی مکھیوں کی گونج سے چونک پڑتا ہوگا۔ جس طرح شفق زرڈل میں چوچلاتی ہوئی کسی نازک اندام کشمیری حسینہ کے ہاتوں سے برف پوش چوٹیوں کا عکس چونک کر ٹوٹ جاتا ہے یہ اور ایسے ہزاروں خوب صورت مناظر دوسری جگہوں پر بھی پائے جاتے ہوں گے، ایسا میں اپنے بچپن میں، اپنے لڑکپن میں اور اپنی جوانی کے پہلے دنوں میں سوچتا تھا۔

لیکن جب میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے اپنے والدین کی مرضی سے

کشمیر سے باہر گیا۔ اس وقت مجھے معلوم ہوا کہ میں کتنا غلط سوچا کرتا تھا۔ جنت کی قدر جنت سے باہر نکل کر ہی معلوم ہوتی ہے، یہ بات نہ تھی کہ کشمیر سے باہر دنیا خوب صورت نہ تھی۔ ساری دنیا حسین ہے، دلکشی اور رعنائی اور موہنی دنیا کے ہر کونے میں ہے، لیکن فطرت کی جو رعنائی، نکھار اور رنگ میں نے کشمیر میں دیکھا ہے۔ کہیں اور نہیں دیکھا۔ اس سے بہتر واضح مترتب صورت میں نے کبھی نہیں دیکھا۔ ممکن ہے یہ میرے بچپن کا خیال ہو، اور آپ جانتے ہیں کہ بچپن کے خیالات کتنے مضبوط ہوتے ہیں وہ کسی طرح دل کے رگ ریشے میں اپنی جڑیں پھیلا لیتے ہیں، میں نے ایسے دوستوں کو بھی دیکھا ہے جو اپنے گاؤں کے املی کے جھاڑ کا ذکر بھی اسی انداز سے کرتے ہیں۔ جس انداز سے میں کشمیر کی گل پوش وادیوں کا ذکر کرتا ہوں، شائد جنت کہیں انسان کے دل کے باہر نہیں ہے، وہ اس کے دل کے اندر ہے، اگر ایسا ہے تب بھی مجھے یہ کہنے میں تامل نہیں ہے کہ میرے دل کے اندر جو جنت ہے وہ کشمیر ہے۔

آج کل میں اس جنت سے دور رہتا ہوں، لیکن پھر بھی اس کی یاد کسی سدابہار پھول کی طرح دل میں ہر وقت مہکتی رہتی ہے اور جب میں صبح دم پھولے پھولے سفید بادلوں والی کشتیوں کے پرے سمندر میں سورج کی کرنوں کو اپنا زریں جال پھینکتے ہوئے دیکھتا ہوں، تو مجھے وہ صبح یاد آجاتی ہے جب میں نے پہلی بار جھیل ولر کو دیکھا تھا۔ جب ہلکی ہلکی دھند ایک ریشمی آنچل کی طرح بار بار گالوں سے چھو جاتی تھی۔ اور جھیل کی نیلی سطح ساکن تھی، اور دور دور نیلگوں پہاڑ ایک دائرے کی صورت میں پھیلے ہوئے تھے۔ اور چپو میرے ہات میں رک گیا تھا، اور میری کشتی کے قریب نیلوفر کے پھول حیرت سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ اور دور ایک بڑی سی کشتی میں ایک ملاح بیٹھا تھا۔ اور اس کی بیوی ایک بچے کو گود میں لئے کھڑی تھی

اور ادھر دیکھ رہی تھی جدھر سے سورج طلوع ہوتا ہے۔ مجھے اس وقت وہ ماں بالکل مجسم دعا معلوم ہوئی۔ جیسے دھرتی ماتا ہو اور آسمان کائنات کا مندر ہو۔ اور بچہ لوبان کی مہک ہو' اور پھر نیلگوں چوٹیوں سے سورج ابھر آیا۔ اور یکایک بچہ کھکھلا کر ہنس پڑا اور ساری دُنیا جاگ گئی اور مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے ملاح کا چپو اندر نیلوفر کے کلپنتے ہوئے پھول، اور جھیل کی خاموش سطح اور پہاڑوں کی نیلگوں چوٹیاں سانس روکے اس ہنسی کی منتظر تھیں، سورج نکلا بچہ ہنسا اور دُنیا جاگ گئی اور رنگوں سے معمور ہو گئی:

یاد کی سُرمئی وادیوں میں کشمیر کے کئی نگینے چمک اُٹھتے ہیں، بہرام گلے سے پرے ایک وادی تھی، جہاں میں راستہ بھول کر آنکلا تھا مکئی کا ایک ڈھلوان کھیت تھا جس میں فصل اچھی طرح پھولی پھلی نہیں تھی، مکئی کے پودے چھدرے چھدرے تھے اور آڑے ترچھے اُگے ہوئے تھے، کھیت کے بیچ میں ایک مچان تھا جو بھوری گھاس سے چھتا ہوا تھا، لیکن مچان پر کوئی نہ تھا، دوپہر کا وقت تھا اور مجھے بہت زور کی بھوک لگ رہی تھی۔ میں آگے بڑھتا چلا گیا۔ آگے گھاس کا ایک لمبا سا قطعہ تھا۔ جس میں ڈیفی ڈول کے پیلے پیلے پھول کھلے ہوئے تھے۔ اس سے آگے اونچائی پر آلوچے کا ایک پیڑ تھا۔ جو سفید سفید پھولوں سے بھرا ہوا تھا۔ اور اس کے قریب ایک چھت تھی، جس پر اُس کے گھر کے لوگ کھانا کھا رہے تھے، ایک بڑھا موچی تھا۔ جس کی سفید داڑھی تھی اور تانبے ایسی رنگت تھی۔ ایک اس کا جوان بیٹا تھا۔ جس کی نیلی آنکھوں میں ایک خوش آئندہ تبسم تھا۔ ایک اس جوان بیٹے کی خوبصورت بیوی تھی۔ جس کی گود ایک پیارا سا بچہ تھا۔ دو بہنیں تھیں۔ ایک ان کا چھوٹا بھائی تھا۔ جس نے صرف ایک میلی چکٹ سی قمیض پہن رکھی تھی، اور جو مجھے دیکھ کر کھاتے کھاتے ٹھٹھک گیا تھا اور پھر ہنسنے لگا تھا۔ ادھر چاول اور

کرشن کا ساگ اس کی انگلیوں سے لگا ہوا تھا، اور اس کی آنکھوں میں وہ حیرت تھی جو اجنبی کو دیکھ کر ہوتی ہے اور لبوں پر وہ تبسم تھا جو ڈر سے نہیں، بے فکری سے پیدا ہوتا ہے۔ مجھے دیکھ کر بڈھا موچی مسکرایا۔ اس نے مجھ سے یہ بھی نہیں پوچھا کہ تم کون ہو۔ کہاں سے آئے ہو، کدھر جا رہے ہو، تمہارا نام کیا ہے۔ تمہارا مذہب کیا ہے؟ اور اس نے مجھے کھانا کھانے کو کہا۔ اور میں وہیں اس سرخ بجری کی چھت پر بیٹھ کر ان لوگوں کے ساتھ کھانا کھانے لگا۔ اور ایک بہن نے میرے سامنے مٹی کے پیالے میں چاول اور ساگ رکھ دیا۔ اور سفید مکھن کا ایک گولا۔ اور سرخ پسی ہوئی مرچیں اور نمک، اور میں کھانے لگا۔ اور ہم لوگ اس طرح باتیں کرنے لگے، جیسے وہ لوگ برسوں سے مجھے جانتے۔ جیسے میں ان کے گھر کا ہی ایک فرد ہوں۔ اور پھر کھانا کھا کے بڈھا موچی ایک چھوٹے سے رندے سے جوتا کھانے لگا۔ اور جوان بیٹا کھلی ہوئی دھوپ کو تیز سمجھ کر آلوچے کے پیڑ کے نیچے بیٹھ کر ایک پرانے جوتے میں تلا لگانے لگا، اور مجھ سے باتیں کرنے لگا۔ اس کی بیوی بھی ہمارے پاس آن بیٹھی اور چادر کی اوٹ میں اپنے بچے کو چھپا کے دودھ پلانے لگی، اور جوان موچی مجھ سے کہنے لگا، ”اب کے مکئی کی فصل اچھی نہیں ہوئی ہے اسے دیمک مار گئے ہیں، اور گھاس بھی جگہ جگہ سے بیٹھ گئی ہے۔“ اتنے میں وہ دونوں شریر بہنیں آلوچے کے پیڑ پر چڑھ گئیں، اور شاخیں ہلا ہلا کر انہوں نے اتنے پھول اوپر برسائے کہ ہم سفید سفید پھولوں سے لد گئے اور چھت کے دوسرے کونے کے قریب کھلی دھوپ میں بیٹھا ہوا بڈھا موچی ہنسنے لگا، اور کھلی دھوپ میں اس کے سفید دانت چمک رہے تھے اور اس کے تانبہ ایسے گال چمک رہے تھے۔ اور سکی گہری نیلی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ اور وہ دونوں شریر بہنیں ہم پہ پھول مار رہی تھیں۔ اور جوان موچی کے سر پہ پھول تھے اور جوتے کے تلے اور پھول تھے۔

اور پھول میری عینک کی کمانی پر اٹک گئے تھے ۔ اور پھولوں سے اس عورت کی چادر بھر گئی تھی۔ اور اس کے بچے کے ننھے ننھے پاؤں پھولوں میں گندھے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ اور جب میں سستا چکا تو میں نے اس بڈھے موچی کو اور اس کے بیٹے کو اور اس کی بیوی کو سلام کیا۔ اور پھر وہ دونوں شریر بہنیں اور ان کا چھوٹا بھائی جس نے صرف ایک میلی چکٹ قمیض پہن رکھی تھی اور جو میری عینک کی طرف دیکھ کے ہنستا تھا۔ وہ تینوں مجھے ڈھلوان سے آگے راستہ بتانے کے لئے آئے اور جب وہ مجھے راستہ پر لگا چکے تو چشمے کے کنارے کھیلنے بیٹھ گئے۔ اور شائد دوسرے لمحے ہی میں مجھے بھول گئے۔ لیکن میں انھیں نہیں بھولا ہوں۔ وہ بے لوث ہنسی، وہ پاک محبت، مہر و وفا کی وہ مقدس نشانی جو اس زندگی کے سفر میں ایک انسان دوسرے انسان کو دیتا ہے، وہ آج بھی میرے سینے میں اسی طرح محفوظ ہے۔

مجھے کشمیر گئے ہوئے مدتیں گزر گئیں اس عرصے میں کشمیر بہت کچھ بدل چکا ہے۔ کیونکہ یہ جنت نظیر ملک انسانی جنت ہے اور انسانوں کی جنت ہمیشہ بدلتی رہتی ہے۔ میں نے اس زمانہ میں بھی اس جنت میں دوزخ کے دہکتے ہوئے انگارے دیکھے تھے، نکبت و یاس کے مرقعے، افلاس کے بھیانک نقوش، حسن فردوس کی خرید و فروخت، میں جانتا تھا۔ یہ دہکتے ہوئے انگارے ایک روز بھڑک کر آتش فشاں جوالا مکھی بن جائیں گے اور یہ لاوا دور دور تک کشمیر کے حسین مرغزاروں اور وادیوں میں پھیل جائے گا اور وہی ہوا جس کا مجھے اندیشہ تھا اور کشمیر کی حسین و جمیل وادی خاک و خوں میں لتھڑ گئی۔

اور آج میں اپنی جنت نظیر سے بہت دور بیٹھا ہوں۔ اور آج میں نہیں کہہ سکتا کہ وہ ماں کہاں ہے جو طلوع آفتاب سے پہلے جھیل ڈلر کے بیچ

میں اپنے نوزائیدہ بچے کو لئے مجسم دعا بن کے کھڑی تھی، اس کا وہ خاوند کہاں ہے جو دونوں ہاتھ چپوؤں پر رکھے اسی کشتی میں بیٹھا تھا اور اپنی بیوی کو پیار بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ آج میں نہیں کہہ سکتا کہ کشمیر کی اس عظیم کش مکش نے انھیں کہاں پہنچا دیا ہے، لیکن وہ جہاں کہیں بھی ہوں۔ انھیں میرا سلام پہنچے۔

آج مجھے پھر وہ آلوچے کا پیڑ یاد آتا ہے اور مکئی کے کھیتوں میں بھوری گھاس سے چھپتا ہوا مچان، اور سرخ بجری کی چھت پر بیٹھا ہوا بڈھا موچی جو رندے سے چمڑا گھسا رہا ہے، آج پھر میرے سر کے اوپر آلوچے کے سفید سفید پھول گر رہے ہیں۔ اور میرے کانوں میں ان دونوں شریر بہنوں کی ہنسی ہے اور اس کے لڑکے کا تحیر نما تبسم ہے۔ جس نے صرف ایک میلی چکٹ قمیض پہن رکھی ہے، اور جس کی انگلیوں میں سفید چاول کے دانے اور کڑم کا ساگ لگا ہوا ہے۔ میں نہیں جانتا وہ لوگ آج کہاں ہیں۔ لیکن وہ جہاں بھی ہوں انھیں میرا سلام پہنچے۔

شاید وہ آلوچے کا پیڑ آج پھولوں سے لدا نہیں ہے۔ یہ بھی ممکن ہے۔ مکئی کے ڈھلوان کھیت میں کسی نے ہل نہ چلایا ہو۔ شاید وہ بڈھا موچی اپنے گھر کی سرخ بجری کی چھت پر چمڑا نہیں گھسا رہا بلکہ کسی سڑک کے کنارے پتھر کوٹ رہا ہے اور اس کا بیٹا اس عظیم کش مکش میں اپنی بہنوں کی عصمت کے لئے لڑتے لڑتے مارا گیا ہے۔ شائد آج مکئی کے کھیت میں گھاس سے چھپتے ہوئے مچان پر ایک بیوہ بیٹھی ہے۔ جس کی کالی چادر میں نیا کشمیر دودھ پی رہا ہے۔

ممکن ہے یہ سب کچھ صحیح ہو۔ لیکن میں اتنا ضرور جانتا ہوں کہ کشمیر ہمیشہ جنت نظیر رہے گا۔ اس خاک و خون میں لتھڑی ہوئی وادی کو اس کے بچے بچے سے

خود بسائیں گے۔ آلوچے کے پیڑ میں پھر سے پھول کھلیں گے۔ مکئی کے کھیتوں میں نہرے والوں والے بھٹے پھر سے نظر آئیں گے۔ مٹی کے پیالے میں چاول اور ساگ اور مکھن ہوگا اور بہنوں کی ہنسی ہوگی اور بھائیوں کے قہقہے ۔۔!

فیروز پوری نالے کے اوپر ایک پن چکی ہے، یہاں پتھر کے دو پاٹ تیزی سے گھوم رہے ہیں۔ پانی پن چکی سے آبشار کی طرح گر رہا ہے۔ قریب ہی گھاس کے قطعے میں لمبے لمبے ڈنٹھلوں پر بڑے بڑے سفید پھول جھکے ہوئے ہیں۔ اور ساری فضا میں سونف کے پودوں کی خوشبو ہے۔ میں نے اس تخت پر لیٹے لیٹے گورکی کا ناول "ماں" پڑھا تھا۔

آج میں پھر وہیں جانا چاہتا ہوں۔ اور اس پن چکی کے قریب بیٹھ کے وہی ناول پڑھنا چاہتا ہوں۔ کیونکہ میرا یقین ہے کہ کشمیر کی دھرتی گورکی کی "ماں" ہے۔ وہ دھرتی میری ماں بھی ہے اور لوگ کہتے ہیں کہ ماں کے قدموں تلے جنت ہوتی ہے!

مہالکشمی کا پُل

مہالکشمی اسٹیشن کے اس پار مہالکشمی جی کا ایک مندر ہے۔ اسے لوگ ریس کورس بھی کہتے ہیں۔ اس مندر میں پوجا کرنے والے ہارتے زیادہ ہیں، جیتتے بہت کم ہیں۔ مہالکشمی اسٹیشن کے اس پار ایک بہت بڑی بدرو ہے۔ جو انسانی جسموں کی غلاظت کو اپنے متعفن پانیوں گھولتی ہوئی شہر سے باہر چلی جاتی ہے۔ مندر میں انسان کے دل کی غلاظت دھلتی ہے اور بدرو میں انسان کے جسم کی غلاظت اور ان دونوں کے بیچ میں مہالکشمی کا پُل ہے۔ مہالکشمی کے پل کے اُوپر بائیں طرف لوہے کے جنگلے پر چھ ساڑھیاں لہرا رہی ہیں۔ پُل کے اس طرف ہمیشہ اس مقام پر چند ایک ساڑھیاں لہراتی رہتی ہیں۔ یہ ساڑھیاں کوئی بہت قیمتی نہیں ہیں۔ ان کے پہننے والے بھی کوئی بہت زیادہ قیمتی نہیں ہیں۔ یہ لوگ یہاں ہر روز ان ساڑھیوں کو دھو کر سوکھنے کے لئے ڈال دیتے ہیں اور ریلوے لائن کے آر پار جاتے ہوئے لوگ۔ مہالکشمی اسٹیشن پر گاڑی کا انتظار کرتے ہوئے لوگ گاڑی کی کھڑکی اور دروازوں سے جھانک کر باہر دیکھنے والے لوگ اکثر ان ساڑھیوں کو ہوا میں جھولتا ہوا دیکھتے ہیں، وہ ان کے مختلف رنگ دیکھتے ہیں۔ بھورا، گہرا بھورا، مٹ میلا نیلا، قرمزی بھورا۔ گندا سرخ، کنارا گہرا نیلا اور لال۔ وہ لوگ اکثر انھیں رنگوں کو فضا میں پھیلے ہوئے دیکھتے ہیں ایک لمحے کے لئے دوسرے لمحے میں گاڑی پُل کے نیچے سے گذر جاتی ہے

ان ساڑھیوں کے رنگ اب جاذبِ نظر نہیں رہے۔ کسی زمانہ میں ممکن ہے جب یہ نئی نئی خریدی گئی ہوں، ان کے رنگ خوب صورت اور چمکتے ہوئے ہوں۔ مگر

اب نہیں رہیں۔ متواتر دھوئے جانے سے ان کے رنگوں کی آب و تاب مر چکی ہے اور اب یہ ساڑھیاں اپنے پھیکے پھیکے روزمرہ کے انداز کو لئے بڑی بے دلی سے جنگلی پر پڑی نظر آتی ہیں۔ آپ دن میں انھیں سو بار دیکھتے یہ آپ کو کبھی خوبصورت دکھائی نہ دیں گی۔ نہ ان کا رنگ روپ اچھا ہے۔ نہ ان کا کپڑا یہ بڑ سستی، گھٹیا قسم کی ساڑھیاں ہیں۔ ہر روز دھلنے سے ان کا کپڑا بھی تار تار ہو رہا ہے۔ ان میں کہیں کہیں روزن بھی نظر آتے ہیں۔ کہیں اُدھڑے ہوئے ٹانکے ہیں۔ کہیں بدنما چتلے داغ جو اس قدر پائیدار ہیں کہ دھوئے جانے سے بھی نہیں دُھلتے بلکہ اور گہرے ہوتے جاتے ہیں۔ میں ان ساڑھیوں کی زندگیوں کو جانتا ہوں۔ کیونکہ میں ان لوگوں کو جانتا ہوں جو ان ساڑھیوں کو استعمال کرتے ہیں یہ لوگ جہانگیر کے پُل کے قریب ہی بائیں طرف آٹھ نمبر کی چال میں رہتے ہیں۔ یہ چال متوالی نہیں ہے۔ بڑی غریب سی چال ہے۔ میں بھی اسی چال میں رہتا ہوں اس لئے آپ کو ان ساڑھیوں اور ان کے پہننے والوں کے متعلق سب کچھ بتا سکتا ہوں، ابھی وزیر اعظم کی گاڑی آنے میں بہت دیر ہے۔ آپ انتظار کرتے کرتے اُکتا جائیں گے۔ اس لئے اگر آپ ان چھ ساڑھیوں کی زندگی کے بارے میں مجھ سے کچھ سُن لیں تو وقت آسانی سے کٹ جائے گا، ادھر یہ جو بھورے رنگ کی ساڑھی لٹک رہی ہے۔ یہ شانتا بائی کی ساڑھی ہے۔ اس کے قریب جو ساڑھی لٹک رہی ہے وہ بھی آپ کو بھورے رنگ کی دکھائی دیتی ہوگی، مگر وہ تو گہرے بھورے رنگ کی ہے۔ آپ نہیں، میں اس کا گہرا بھورا رنگ دیکھ سکتا ہوں۔ کیونکہ میں اسے اس وقت سے جانتا ہوں جب اس کا رنگ چمکتا ہوا گہرا بھورا تھا۔ اب اس دوسری ساڑھی کا رنگ بھی ویسا ہی بھورا ہے جیسا شانتا بائی کی ساڑھی کا۔ اور شاید آپ ان دونوں ساڑھیوں میں بڑی مشکل سے کوئی فرق محسوس کر سکیں۔ میں بھی جب ان کے پہننے والوں کی زندگیوں کو دیکھتا ہوں، تو بہت کم فرق محسوس کرتا ہوں۔ مگر یہ پہلی ساڑھی جو بھورے رنگ کی ہے۔ وہ شانتا بائی کی ساڑھی ہے اور جو دوسری

بھورے رنگ کی ساڑھی ہے اور جس کا گہرا بھورا رنگ صرف میری آنکھیں دیکھ سکتی ہیں وہ جیونا بائی کی ساڑھی ہے۔

شانتا بائی کی زندگی بھی اس کی ساڑھی کے رنگ کی طرح بھوری ہے۔ شانتا بائی برتن مانجنے کا کام کرتی ہے۔ اس کے تین بچے ہیں۔ ایک بڑی لڑکی ہے، دو چھوٹے لڑکے ہیں۔ بڑی لڑکی کی عمر چھ سال کی ہوگی۔ سب سے چھوٹا لڑکا دو سال کا ہے۔ شانتا بائی کا خاوند سیلون مل کے کپڑے کھاتے میں کام کرتا ہے۔ اُسے بہت جلد جانا ہوتا ہے اس لئے شانتا بائی اپنے خاوند کے لئے دوسرے دن کی دوپہر کا کھانا رات ہی کو پکا رکھتی ہے۔ کیونکہ صبح اُسے خود برتن صاف کرنے کے لئے اور پانی ڈھونے کے لئے دوسرے گھروں میں جانا ہوتا ہے اور اب وہ ساتھ میں اپنے چھ برس کی بچی کو بھی لے جاتی ہے اور دوپہر کے قریب چال میں واپس آتی ہے۔ واپس آکے وہ نہاتی ہے اور اپنی ساڑھی دھوتی ہے اور سکھانے کے لئے پل کے جنگلے پر ڈال دیتی ہے اور پھر ایک بے حد غلیظ اور پرانی دھوتی پہن کر کھانا پکانے لگ جاتی ہے شانتا بائی کے گھر چولھا اسی وقت سلگ سکتا ہے۔ جب دوسروں کے ہاں چولھے ٹھنڈے ہو جائیں، یعنی دوپہر کے دو بجے اور رات کو نو بجے۔ ان اوقات کے اِدھر اور اُدھر اُسے دونوں وقت گھر سے باہر برتن مانجنے اور پانی ڈھونے کا کام کرنا ہوتا ہے۔ اب تو چھوٹی لڑکی بھی اس کا ہاتھ بٹاتی ہے۔ شانتا بائی برتن صاف کرتی ہے، چھوٹی لڑکی برتن دھوتی جاتی ہے۔ دو تین بار ایسا بھی ہوا کہ چھوٹی لڑکی کے ہاتھ سے چینی کے برتن گر کر ٹوٹ گئے۔ اب میں جب کبھی چھوٹی لڑکی کی آنکھیں سوجھی ہوئی اور اس کے گال سُرخ دیکھتا ہوں تو سمجھ جاتا ہوں کہ کسی بڑے گھر میں چینی کے برتن ٹوٹے ہیں۔ اس دن شانتا بھی میری منتے کا جواب نہیں دیتی۔ جلتی، بھنتی، بڑبڑاتی چولھا سلگانے میں مصروف ہو جاتی ہے۔ چھوٹا لڑکا جو دو سال کا ہے دھوئیں سے اپنا دم گھٹتا دیکھ کر چیختا ہے

توشانتا بائی اس کے چینی ایسے نازک رخساروں پر زور زور کی چپتیں لگانے سے باز نہیں آتی اس پر بچہ اور زیادہ چیختا ہے۔ یوں تو یہ دن بھر روتا رہتا ہے۔ کیونکہ اسے دودھ نہیں ملتا اور اسے اکثر بھوک لگی رہتی ہے اور دو سال کی عمر ہی میں اسے باجرے کی روٹی کھانا پڑتی ہے۔ اسے اپنی ماں کا دودھ اپنے دوسرے بھائی بہن کی طرح صرف پہلے چھ سات ماہ نصیب ہوا وہ بھی بڑی مشکل سے۔ پھر یہ بھی خشک باجری اور ٹھنڈے پانی پر پلنے لگا۔ ہماری چال کے سارے بچے اسی خوراک پر پلتے ہیں۔ وہ دن بھر ننگے رہتے ہیں اور رات کو گدڑی اوڑھ کر سو جاتے ہیں۔ سوتے میں بھی وہ بھوکے رہتے ہیں اور جاگتے میں بھی بھوکے رہتے ہیں۔ اور جب شانتا بائی کے خاوند کی طرح بڑے ہو جاتے ہیں تو دن بھر خشک باجری اور ٹھنڈا پانی پی پی کر کام کرتے جاتے ہیں اور ان کی بھوک بڑھتی جاتی ہے اور ہر وقت معدے کے اندر اور دل کے اندر اور دماغ کے اندر ایک بوجھل سی دھمک محسوس کرتے رہتے ہیں اور جب پگار ملتی ہے تو ان میں سے کئی ایک سیدھے تاڑی خانے کا رخ کرتے ہیں۔ تاڑی پی کر چند گھنٹوں کے لئے یہ دھمک زائل ہو جاتی ہے۔ لیکن آدمی ہمیشہ تو تاڑی نہیں پی سکتا۔ ایک دن پئے گا۔ دو دن پئے گا، تیسرے دن کی تاڑی کے لئے پیسے کہاں سے لائے گا۔ آخر کھولی کا کرایہ دینا ہے، راشن کا خرچہ ہے، بھاجی ترکاری ہے، تیل اور نمک ہے، بجلی اور پانی ہے، شانتا بائی کی بھوری ساڑھی ہے۔ جو چھٹے ساتویں ماہ تار تار ہو جاتی ہے۔ کبھی سات ماہ سے زیادہ نہیں چلتی۔ یہ مل والے بھی پانچ روپے چار آنے میں کیسی کھدری نکمی ساڑھی دیتے ہیں۔ اس کے کپڑے میں ذرا جان نہیں ہوتی، چھٹے ماہ سے جو تار تار ہونا شروع ہوتا ہے تو ساتویں ماہ بڑی مشکل سے سی کے، جوڑ کے، گانٹھ کے، ٹانکے لگا کے کام دیتا ہے اور پھر وہی پانچ روپے چار آنے خرچ کرنا پڑتے ہیں اور وہی بھورے رنگ کی

ساڑھی آجاتی ہے۔ شانتا کو یہ رنگ بہت پسند ہے اس لئے کہ یہ میلا بہت دیر میں ہوتا ہے۔ اسے گھروں میں جھاڑو دینا ہوتی ہے، برتن صاف کرنے ہوتے ہیں تیسری چوتھی منزل تک پانی ڈھونا ہوتا ہے وہ بھورا رنگ نہیں پسند کرے گی تو کیا کھلتے ہوئے شوخ رنگ، گلابی، بسنتی، نارنجی پسند کرے گی۔ لامنہ وہ اتنی بے وقوف نہیں ہے، وہ تین بچوں کی ماں ہے۔ لیکن کبھی اس نے یہ شوخ رنگ بھی دیکھے تھے، پہنے تھے۔ انھیں اپنے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ پیار کیا تھا۔ جب وہ دھاروار میں اپنے گاؤں میں تھی۔ جہاں اس نے بادلوں میں شوخ رنگوں والی دھنک دیکھی تھی۔ جہاں میلوں میں اس نے شوخ رنگ ناچتے ہوئے دیکھے تھے۔ جہاں اس کے باپ کے دھان کے کھیت تھے۔ ایسے شوخ ہرے ہرے رنگ کے کھیت اور آنگن میں پیر دکا پیڑ جس کے ڈال ڈال سے وہ پیرو توڑ توڑ کے کھایا کرتی تھی۔ جانے اب پیروؤں میں وہ مزا ہی نہیں ہے۔ وہ شیرینی اور گھلاوٹ ہی نہیں ہے۔ وہ رنگ وہ چمک دمک کہاں جا کے مرگئی۔ وہ سارے رنگ کیوں یک لخت بھورے ہوگئے۔ شانتا بائی کبھی برتن مانجتے، کھانا پکاتے، اپنی ساڑھی دھوتے، اسے پل کے جنگلے پر لاکر ڈالتے ہوئے یہ سوچا کرتی ہے اور اس کی بھوری ساڑھی سے پانی کے قطرے آنسوؤں کی طرح ریل کی پٹری بنتے جاتے ہیں اور دور سے دیکھنے والے لوگ ایک بھورے رنگ کی بدصورت عورت کو پل کے اوپر جنگلے پر ایک بھوری ساڑھی کو پھیلاتے ہوئے دیکھتے ہیں اور بس دوسرے لمحے میں گاڑی پل کے نیچے سے گذر جاتی ہے۔

جیونا بائی کی ساڑھی جو شانتا بائی کی ساڑھی کے ساتھ لٹک رہی ہے گہرے بھورے رنگ کی ہے۔ بظاہر اس کا رنگ شانتا بائی کی ساڑھی سے بھی پھیکا نظر آئے گا۔ لیکن اگر آپ اسے غور سے دیکھیں گے تو اس پھیکے پن کے باوجود یہ آپ کو گہرے بھورے رنگ کی نظر آئے گی۔ یہ ساڑھی بھی پانچ روپے چار آنے کی ہے۔

اور بڑی ہی بوسیدہ ہے۔ دو ایک جگہ سے پھٹی ہوئی تھی۔ لیکن اب وہاں پر ٹانکے لگ گئے ہیں۔ اور اتنی دور سے معلوم بھی ہوتے ہیں۔ ہاں آپ وہ بڑا ٹکڑا ضرور دیکھ سکتے ہیں جو گہرے نیلے رنگ کا ہے۔ اور اس ساڑھی کے بیچ میں جہاں سے یہ ساڑھی بہت پھٹ چکی تھی لگایا گیا ہے۔ یہ ٹکڑا جیونا بائی کی اس پہلی ساڑھی کا ہے۔ اور اس دوسری ساڑھی کو مضبوط بنانے کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔ جیونا بائی بیوہ ہے اس لئے وہ ہمیشہ پرانی چیزوں سے نئی چیزوں کو مضبوط بنانے کے ڈھنگ سوچا کرتی ہے جیونا بائی اپنے اس خاوند کے لئے روتی رہتی ہے جس نے ایک دن اسے نشے میں مار مار کر اس کی ایک آنکھ کانی کرا لی تھی وہ اس لئے نشے میں تھا کہ وہ اسی روز مل سے نکالا گیا تھا۔ بڈھا ڈھونڈو اب مل میں کسی کام کا نہیں رہا تھا۔ گو وہ بہت تجربہ کار تھا، لیکن اس کے ہاتھوں میں اتنی طاقت نہ رہی تھی کہ وہ جوان مزدوروں کا مقابلہ کر سکتا۔ بلکہ وہ تو اب دن رات کھانسی میں مبتلا رہنے لگا تھا۔ کپاس کے ننھے ننھے ریشے اس کے پھیپھڑوں میں جا کے ایسے دھنس گئے تھے جیسے چرخیوں اور انجنوں میں سوت کے چھوٹے چھوٹے مہین تاگے پھنس جاتے ہیں۔ جب برسات آتی تو یہ ننھے ننھے ریشے اُسے دمے میں مبتلا کر دیتے اور جب برسات نہ ہوتی تو وہ دن بھر اور رات بھر کھانستا۔ ایک خشک اور مسلسل کھنکھار گھر میں اور کارخانے میں جہاں وہ کام کرتا تھا۔ سنائی دیتی رہتی۔ مل کے مالک نے اس کھانسی کی خطرناک گھنٹی کو سنا اور ڈھونڈو کو مل سے نکال دیا۔ ڈھونڈو اس کے چھ ماہ بعد مر گیا۔ جیونا بائی کو اس کے مرنے کا بہت غم ہوا۔ کیا ہوا اگر غصہ میں آ کے ایک دن اس نے جیونا کی آنکھ نکال لی۔ تیس سال کی شادی شدہ زندگی ایک لمحے کے غصہ پر قربان نہیں کی جا سکتی۔ اور اس کا غصہ بجا تھا۔ اگر مل مالک ڈھونڈو کو یوں بے قصور نوکری سے الگ نہ کرتا تو کیا جیونا کی آنکھ نکل سکتی تھی، ڈھونڈو ایسا نہ تھا، اسے اپنی بیکاری کا غم تھا۔ اپنی ۳۵ سالہ ملازمت

سے برطرف ہونے کا رنج تھا اور سب سے بڑا رنج اس بات کا تھا کہ مل مالک نے چلتے وقت اُسے ایک دھیلا بھی تو نہیں دیا۔ ۲۵ سال پہلے جیسے ڈھونڈو خالی ہات مل میں کام کرنے کے لیے آیا تھا اسی طرح خالی ہات واپس لوٹا اور دروازے سے باہر نکلنے پر اور اپنا نمبری کارڈ پیچھے چھوڑ آنے پر اُسے ایک دھچکا سا لگا۔ باہر آکے اسے ایسا معلوم ہوا جیسے ان ۲۵ سالوں میں کسی نے اس کا سارا رنگ، اس کا سارا خون، اس کا سارا رس چوس لیا ہو اور اسے بیکار سمجھ کے باہر کوڑے کرکٹ کے ڈھیر پر پھینک دیا۔ اور ڈھونڈو بڑی حیرت سے مل کے دروازے کو اور اس بڑی چمنی کو دیکھنے لگا جو بالکل اس کے سر پر ایک خوفناک دیو کی طرح آسمان سے لگی کھڑی تھی۔ یکایک ڈھونڈو نے غم اور غصہ سے اپنے ہات ملے۔ زمین پر زور سے تھوکا اور پھر تاڑی خانہ میں چلا گیا۔

لیکن جیونا کی ایک آنکھ جب بھی نہ جاتی۔ اگر اس کے پاس علاج کے لئے پیسے ہوتے۔ وہ آنکھ تو گل گل کر، سڑ سڑ کر، خیراتی ہسپتالوں میں ڈاکٹروں، کمپونڈروں اور نرسوں کی بد احتیاطی اور گالیوں اور لاپروائیوں کا شکار ہو گئی اور جب جیونا اچھی ہوئی تو ڈھونڈو بیمار پڑ گیا اور ایسا بیمار پڑا کہ پھر بستر سے نہ اُٹھ سکا۔ ان دنوں میں جیونا اس کی دیکھ بھال کرتی تھی ــ شانتا بائی نے مدد کے طور پر اسے چند گھروں میں برتن مانجنے کا کام دلوا دیا تھا۔ اور گو وہ اب بوڑھی تھی اور مشاقی اور صفائی سے برتنوں کو صاف نہ رکھ سکتی تھی پھر بھی وہ آہستہ آہستہ رینگ رینگ کر اپنے کمزور ہاتوں میں جھوٹی طاقت کے بودے سہارے پر جیسے تیسے کام کرتی رہی، خوبصورت لباس پہننے والی، خوشبودار تیل لگانے والی بیویوں کی گالیاں سنتی رہی۔ اور کام کرتی رہی۔ کیونکہ اس کا ڈھونڈو بیمار تھا اور اسے اپنے آپ کو اور اپنے خاوند کو زندہ رکھنا تھا۔ لیکن ڈھونڈو زندہ نہ رہا، اور اب جیونا بائی اکیلی تھی۔ خیریت اس میں تھی کہ بالکل اکیلی تھی۔ اور اب اسے صرف اپنا دھندا کرنا تھا شادی

کے دو سال بعد اس کے ہاں ایک لڑکی پیدا ہوئی۔ لیکن جب وہ جوان ہوئی تو کسی بدمعاش کے ساتھ بھاگ گئی۔ اور اس کا آج تک کسی کو پتہ نہ چلا کہ وہ کہاں ہے۔ پھر کسی نے بتایا اور پھر یہیں بہت سے لوگ نے بتایا کہ جیونا بائی کی بیٹی فارس روڈ پر چمکیلا' بھڑکیلا لباس پہنے بیٹھی ہے۔ لیکن جیونا کو یقین نہ آیا۔ اس نے اپنی ساری زندگی پانچ روپے چار آنے کی دھوتی پہنے بسر کر دی تھی اور اسے یقین تھا کہ اس کی لڑکی بھی ایسا کریگی۔ وہ ایسا نہ کریگی، اس کا اُسے کبھی خیال بھی نہیں آیا تھا وہ کبھی فارس روڈ نہیں گئی کیونکہ اسے اس کا یقین تھا کہ اس کی بیٹی وہاں نہیں ہے۔ بھلا اس کی بیٹی وہاں کیوں جانے لگی۔ یہاں اپنی کھولی میں کیا نہیں تھا۔ پانچ روپے چار آنے والی دھوتی تھی۔ باجرے کی روٹی تھی۔ ٹھنڈا پانی تھا۔ سوکھی عزت تھی۔ اور یہ سب کچھ چھوڑ کے وہ فارس روڈ کیوں جانے لگی۔ اسے تو کوئی بدمعاش اپنی محبت کا سبز باغ دکھا کے لے گیا تھا۔ کیونکہ عورت محبت کے لئے سب کچھ کر گزرتی ہے، خود وہ تیس سال پہلے اپنے ڈھونڈ کے لئے اپنے ماں باپ کا گھر چھوڑ کر یہیں چلی آئی تھی۔ جس دن ڈھونڈو مرا اور جب لوگ اس کی لاش کو جلانے کے لئے لیجانے لگے اور جیونا نے اپنی سیندور کی ڈبیہ اپنی بیٹی کی انگیا پہ انڈیل دی جو اس نے بڑی مدت سے ڈھونڈو کی نظروں سے چھپا کے رکھی تھی۔ عین اسی وقت ایک گدرائے ہوئے جسم کی بھاری عورت بڑا چمکیلا لباس پہنے اس سے آ کے لپٹ گئی اور پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی اور اسے دیکھ کر یکایک جیونا کو یقین آگیا کہ جیسے اب سب کچھ مر گیا ہے اس کا پتی، اس کی بیٹی، اس کی عزت، جیسے وہ زندگی بھر روٹی نہیں ملاظت کھاتی رہی ہے جیسے اس کے پاس کچھ نہیں تھا۔ شروع ہی سے کچھ نہیں تھا۔ پیدا ہونے سے پہلے ہی اس سے سب کچھ چھین لیا گیا تھا۔ اسے ننگا، ننگا اور بے عزت کر دیا گیا تھا اور جیونا کو اس ایک لمحہ میں احساس ہوا کہ وہ جگہ جہاں اس کا خاوند زندگی بھر کام کرتا

رہا اور وہ جہاں اس کی آنکھ اندھی ہوگئی اور وہ جگہ جہاں اس کی بیٹی اپنی دکان سجا کے بیٹھ گئی، ایک بہت بڑا اندھا کارخانہ ہے۔ جس میں کوئی ظالم جابر ہات انسانی جسموں کے لئے گنّے کا رس نکالنے والی مشین میں ٹھونستا جاتا ہے۔ اور دوسرے ہات سے توڑ مروڑ کر دوسری طرف پھینکتا جاتا ہے، اور یکایک جیونا اپنی بیٹی کو دھکّا دے کے الگ کھڑی ہوگئی اور چیخیں مار مار کر رونے لگی۔

تیسری ساڑھی کا رنگ مٹ میلا نیلا ہے، یعنی نیلا بھی ہے اور میلا بھی ہے اور مٹیالا بھی ہے۔ کچھ ایسا عجیب سا رنگ ہے جو بار بار دھونے پر بھی نہیں نکھرتا بلکہ اور غلیظ ہوتا جاتا ہے۔ یہ میری بیوی کی ساڑھی ہے۔ میں فورٹ میں دھنو بھائی کی فرم میں کلرکی کرتا ہوں، مجھے پینسٹھ روپے تنخواہ ملتی ہے۔ سیوٗن مل اور لکھسر یا مل کے مزدوروں کو بھی یہی تنخواہ ملتی ہے۔ اس لئے میں بھی انھیں کے ساتھ آٹھ نمبر کی چال کی ایک کھولی میں رہتا ہوں۔ مگر میں مزدور نہیں ہوں، کلرک ہوں، میں فرم میں نوکر ہوں، میں دسویں پاس ہوں، میں ٹائپ کر سکتا ہوں، میں انگریزی میں لکھ سکتا ہوں، میں اپنے وزیر اعظم کی تقریر جلسے میں سن کر سمجھ بھی لیتا ہوں۔ آج تھوڑی دیر میں اُن کی گاڑی مہالکشمی پر آئے گی۔ نہیں وہ ریس کورس نہیں جائیں گے۔ وہ سمندر کے کنارے ایک شاندار تقریر کریں گے۔ اس موقع پر لاکھوں آدمی جمع ہوں گے ان لاکھوں میں میں بھی ایک ہوں گا، میری بیوی کو اپنے وزیر اعظم کی باتیں سننے کا بہت شوق ہے۔ مگر میں اسے اپنے ساتھ نہیں لے جا سکتا۔ کیونکہ ہمارے آٹھ بچّے ہیں۔ اور گھر میں ہر وقت پریشانی سی رہتی ہے۔ جب دیکھو کوئی نہ کوئی چیز کم ہو جاتی ہے۔ راشن تو روز کم پڑ جاتا ہے۔ اب نل میں پانی بھی کم آتا ہے رات کو سونے کے لئے جگہ بھی کم پڑتی ہے، اور تنخواہ تو اس قدر کم پڑتی ہے کہ مہینہ میں صرف پندرہ دن چلتی ہے، باقی پندرہ دن سودخور پٹھان چلاتا ہے اور وہ بھی کیسے، گالیاں

بکتے جھکتے، گھسٹ گھسٹ کر کسی سُست رفتار مال گاڑی کی طرح یہ زندگی چلتی ہے۔

میرے آٹھ بچے ہیں، مگر یہ اسکول میں نہیں پڑھ سکتے۔ میرے پاس اُن کی فیس کے پیسے کبھی نہ ہوں گے۔ پہلے پہل جب میں نے بیاہ کیا تھا اور ساوتری کو اپنے گھر یعنی اس کھولی میں لایا تھا تو میں نے سوچا تھا، ان دنوں ساوتری بھی بڑی اچھی اچھی باتیں سوچا کرتی تھی، گوبھی کے نازک نازک ہرے ہرے پتوں کی طرح پیاری پیاری باتیں۔ جب وہ مسکراتی تھی تو سینما کی تصویر کی طرح خوب صورت دکھا کرتی تھی۔ اب وہ مسکراہٹ نہ جانے کہاں چلی گئی ہے۔ اس کی جگہ ایک مستقل تیوری نے لے لی ہے۔ وہ ذراسی بات پر بچوں کو بے تحاشا پیٹنا شروع کر دیتی ہے اور میں تو کچھ بھی کہوں، کیسے بھی کہوں، کتنی ہی لجاجت سے کہوں، وہ تو بس مجھے کاٹ کھانے کو دوڑتی ہے۔ پتہ نہیں ساوتری کو کیا ہو گیا ہے۔ پتہ نہیں مجھے کیا ہو گیا ہے میں دفتر میں سیٹھ کی گالیاں جھنتا ہوں، گھر پر بیوی کی گالیاں سنتا ہوں اور ہمیشہ خاموش رہتا ہوں۔ کبھی کبھی سوچتا ہوں، شاید میری بیوی کو ایک نئی ساڑھی کی ضرورت ہے۔ شاید اُسے صرف ایک نئی ساڑھی ہی نہیں، ایک نئے چہرے، ایک نئے گھر، ایک نئے ماحول، ایک نئی زندگی کی ضرورت ہے۔ مگر اب ان باتوں کو سوچنے سے کیا ہوتا ہے۔ اب تو آزادی آ گئی ہے۔ اور ہمارے وزیرِ اعظم نے یہ بھی کہہ دیا ہے کہ اس نسل کو، یعنی ہم لوگوں کو اپنی زندگی میں کوئی آرام نہیں مل سکتا۔ میں نے ساوتری کو اپنے وزیرِ اعظم کی تقریر جو اخبار میں پڑھی تھی سنائی تو وہ اسے سن کر آگ بگولہ ہو گئی، اور اس نے غصہ میں آ کے چولھے کے قریب پڑا ہوا چمٹا میرے سر پہ دے مارا۔ یہ زخم کا نشان جو آپ میرے ماتھے پر دیکھ رہے ہیں، اسی کا نشان ہے۔ ساوتری کی مٹ میلی نیلی ساڑھی پر بھی ایسے کئی زخموں کے نشان ہیں۔ مگر آپ انھیں نہیں دیکھ سکیں گے۔ میں دیکھ سکتا ہوں۔ ان میں سے ایک نشان تو اس موتگیا رنگ کی جارجٹ کی ساڑھی کا ہے جو اس نے اوپیرا ہاؤس کے نزدیک

بھی مل بھوند و رام پارچہ فروش کی دکان پر دیکھی تھی۔ ایک نشان اس کھلونے کا ہے جو پچیس روپے کا تھا اور جسے دیکھ کر میرا پہلا بچّہ خوشی سے کلکاریاں مار کے اگا تھا۔ لیکن جسے ہم خرید نہ سکے اور جسے نہ پاکر میرا بچّہ دن بھر روتا رہا۔ ایک نشان اس تار کا ہے جو ایک دن جبل پور سے آیا تھا۔ جس میں ساوتری کی ماں کی شدید علالت کی خبر تھی۔ ساوتری جبل پور جانا چاہتی تھی۔ لیکن ہزار کوشش کے بعد بھی مجھے کسی سے رُوپے اُدھار نہ مل سکے تھے اور ساوتری جبل پور نہ جاسکی۔ ایک نشان اس تار کا ہے جس میں اس کی ماں کی موت کا ذکر تھا، ایک نشان .... مگر میں کس کس نشان کا ذکر کروں ان سے چلتے چلتے، گدلے گدلے غلیظ داغوں سے ساوتری کی پانچ روپے چار آنے والی ساڑھی سے دوسری ساڑھی میں منتقل ہوتے جائیں گے۔

چوتھی ساڑھی قرمزی رنگ کی ہے اور قرمزی رنگ میں بھورا رنگ بھی جھلک رہا ہے، یوں تو یہ سب مختلف رنگوں کی ساڑھیاں ہیں، لیکن بھورا رنگ ان سب میں جھلکتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ان سب کی زندگی ایک ہے، جیسے ان سب کی قیمت ایک ہے۔ جیسے یہ سب زمین سے کبھی اوپر نہیں اٹھیں گے جیسے انھوں نے کبھی قسم میں ہنستی ہوئی دھنک، افق پر چمکتی ہوئی شفق بادلوں میں لہراتی ہوئی برق نہیں دیکھی۔ جیسے شانتا بائی کی جوانی ہے، وہ جیونا کا بڑھاپا ہے۔ وہ ساوتری کا ادھیڑپن ہے جیسے یہ سب ساڑھیاں، زندگیاں، ایک رنگ، ایک سطح، ایک تواتر، ایک مسلسل یکسانیت لئے ہوئے ہوا میں جھولتی جاتی ہیں۔

یہ قرمزی بھورے رنگ کی ساڑھی جھبّو بھیّئے کی عورت کی ہے۔ اس عورت سے میری بیوی کبھی بات نہیں کرتی، کیونکہ ایک تو اس کے کوئی بچّہ وچّہ نہیں ہے اور ایسی عورت جس کے کوئی بچّہ نہیں ہو بڑی نحس ہوتی ہے۔ وہ جادو ٹونے کرکے دوسروں کے بچوں کو مار ڈالتی ہے اور بد روحوں کو بلاکے اپنے گھر میں بسا لیتی ہے۔ میری بیوی اسے

ہی منہ نہیں لگاتی۔ یہ عورت جھبو بھیا نے خرید کر حاصل کی ہے۔ جھبو بھیا مرادآباد کا رہنے والا ہے۔ لیکن بچپن ہی سے اپنا دیس چھوڑ کے ادھر چلا آیا۔ وہ مراٹھی اور گجراتی زبان بڑے مزے سے گفتگو کر سکتا ہے۔ اسی وجہ سے اُسے بہت جلد پو دار مل کے گئی کھاتے میں جگہ مل گئی۔ جھبو بھیا کو شروع ہی سے بیاہ کا بہت شوق تھا۔ اُسے بیڑی کا، تاڑی کا، کسی چیز کا شوق نہیں تھا۔ شوق تھا تو صرف اس بات کا کہ اس کی شادی جلد سے جلد ہو جائے جب اس کے پاس ستر اسی روپے اکٹھے ہو گئے تو اس نے اپنے دیس جانے کی ٹھانی تاکہ وہاں اپنی برادری سے کسی کو بیاہ لائے، مگر پھر اس نے سوچا ان ستر اسی روپوں میں کیا ہوگا۔ آنے جانے کا کرایہ بھی بڑی مشکل سے پورا ہوگا۔ چار سال کی محنت کے بعد اس نے رقم جوڑی تھی لیکن اس رقم سے وہ مرادآباد جا سکتا تھا، جا کے شادی نہیں کر سکتا تھا۔

اس لئے جھبو بھیا نے یہیں ایک بدمعاش سے بات چیت کر کے اس عورت کو سو روپے میں خرید لیا۔ اسی روپے اس نے نقد دیئے، بیس روپے ادھار میں رہے جو اس نے ایک سال کے عرصے میں ادا کئے۔ بعد میں جھبو کو معلوم ہوا کہ یہ عورت بھی مرادآباد کی رہنے والی تھی، دھیروج گاؤں کی اور اس کی برادری ہی کی تھی۔ جھبو بہت خوش ہوا۔ چلو بیٹھے بیٹھے سب کام ہو گیا۔ اپنی حاجت برادری کی۔ اپنے ضلع کی، اپنے دھرم کی عورت یہیں بیٹھے بٹھائے سو روپے میں مل گئی۔ اس نے بڑے چاؤ چاؤ سے اپنا بیاہ رچایا۔ اور پھر اسے معلوم ہوا کہ اس کی بیوی لاڈلیا بہت اچھا گا لیتی ہے، وہ خود بھی اپنی پاٹ دار آواز سے زور سے گانے بکنے کا نے سے زیادہ چلانے کا شوقین تھا۔ اب تو کھولی میں دن رات گویا کسی نے ریڈیو کھول دیا ہو۔ دن میں کھولی میں لاڈلیا کام کرتے ہوئے گاتی تھی۔ رات کو جھبو اور لاڈلیا دونوں گاتے تھے۔ ان کے ہاں کوئی بچہ نہ تھا، اس لئے انھوں نے ایک طوطا پال رکھا تھا۔ میاں مٹھو خاوند اور بیوی کو گاتے دیکھ دیکھ کر خود بھی لہک لہک کر گانے لگے۔ لاڈلیا میں ایک اور صفت بھی تھی۔ جھبو نہ بیڑی پیتا، نہ سگرٹ، نہ تاڑی

لڑیا۔ بیڑی، سگرٹ، تاڑی سب ہی کچھ پیتی تھی۔ کہتی تھی پہلے وہ سب کچھ نہیں جانتی تھی مگر جب سے وہ بدمعاشوں کے پلے پڑی، اُسے یہ سب بری باتیں سیکھنا پڑیں، اور اب وہ اور سب باتیں تو چھوڑ سکتی ہے، مگر بیڑی اور تاڑی نہیں چھوڑ سکتی۔ کئی بار تاڑی پی کر لڑیا نے جھبّو پر حملہ کیا۔ اور جھبّو نے اُسے روئی کی طرح دھنک کر رکھ دیا۔ اس موقع پر طوطا بہت شور مچاتا تھا۔ اور رات کو دونوں کو گالیاں بکتے دیکھ کر خود بھی پنجرے میں ننگا ہو کر زور زور سے چلّا کر وہی گالیاں بکتا جو وہ دونوں بکتے تھے۔ ایک بار تو اس کی گالی سُن کے جھبّو نے غصّے میں آ کے طوطے کو پنجرے سمیت بدرو میں پھینکنے کا تھا مگر جیونا نے بیچ میں پڑ کر طوطے کو بچا لیا۔ طوطے کو مارنا بڑا پاپ ہے، جیونا نے کہا، تمہیں برہمنوں کو بلا کے پراشچت کرنا پڑے گا، اور تمہیں پندرہ بیس روپے کھل جائیں گے، یہ سوچ کر جھبّو نے طوطے کو بدرو میں غرق کرنے کا خیال ترک کر دیا۔

شروع شروع میں تو جھبّو کو ایسی شادی ... پر چاروں طرف سے گالیاں پڑیں وہ خود بھی لڑیا کو بڑی شبہہ کی نظروں سے دیکھتا رہا۔ اور کئی بار اسے بلا وجہ پیٹا اور خود بھی مل سے غیر حاضر رہ کر اس کی نگرانی کرتا رہا۔ مگر آہستہ آہستہ لڑیا نے اپنا اعتبار سا چال میں قائم کر لیا۔ لڑیا کہتی تھی کہ کوئی عورت سچّے دل سے بدمعاشوں کے پلّے پڑنا پسند نہیں کرتی۔ وہ تو ایک گھر چاہتی ہے، چاہے وہ چھوٹا ہی سا ہو۔ وہ ایک خاوند چاہتی ہے۔ جو اس کا اپنا ہو، چاہے وہ جھبّو بھیا ایسا ہر وقت شور مچانے والا زبان دراز شیخی خورا ہی کیوں نہ ہو۔ وہ ایک ننھا بچہ چاہتی ہے چاہے وہ کتنا ہی بدصورت کیوں نہ ہو۔ اور اب لڑیا کے پاس گھر بھی تھا۔ اور جھبّو بھی تھا اور اگر بچہ نہیں تھا تو کیا ہوا ہو جائے گا۔ اور اگر نہیں ہوتا تو بھگوان کی مرضی۔ یہ میاں مٹھو ہی اس کا بیٹا بنے گا۔

ایک روز لڑیا اپنے میاں مٹھو کا پنجرا جھلا رہی تھی اور اُسے چوری کھلا رہی تھی اور اپنے دن کے سپنوں میں اُس ننھے سے بالک کو دیکھ رہی تھی جو فضا میں ہمکتا ہمکتا اس کی

، کی طرف بڑھتا چلا آرہا تھا۔ کہ چال میں شور سا بڑھنے لگا۔ اور اس نے
نے سے جھانک کر دیکھا کہ چند مزدور جھبو کو اُٹھائے چلے آرہے ہیں۔ اور اُن کے
، خون سے رنگے ہوئے ہیں۔ لڑیا کا دل دھک سے رہ گیا، وہ بھاگتی بھاگتی نیچے
۔ اس نے بڑی دلکشتی سے اپنے خاوند کو مزدوروں سے چھین کے اپنے کندھے
ا لیا۔ اور اپنی کھولی میں لے آئی۔ پوچھنے پر پتہ چلا کہ جھبو سے گنی کھاتے کے
نے کچھ ڈانٹ ڈپٹ کی، اس پر جھبو نے بھی اسے دو ہاتھ جڑ دیئے۔ اس پر بہت
چا اور مینجر نے اپنے بدمعاشوں کو بُلا کر جھبو کی خوب ٹھکائی کی اور اسے مل سے باہر
یا۔ خیریت ہوئی کہ جھبو بچ گیا ورنہ اس کے مرنے میں کوئی کسر نہ تھی۔ لڑیا نے
ت سے کام لیا۔ اس نے اسی روز سے اپنے سر پر ٹوکری اُٹھالی اور گلی گلی ترکاری
بیچنے لگی۔ جیسے وہ زندگی میں یہی دھندا کرتی آئی ہے۔ اس طرح محنت مزدوری
اس نے اپنے جھبو کو اچھا کر لیا۔ جھبو اب بھلا چنگا ہے۔ مگر اب اسے کسی مل میں کام
یں ملتا۔ وہ دن بھر اپنی کھولی میں کھڑا لکشمی کے اسٹیشن کے چاروں طرف بلند
کارخانوں کی چمنیوں کو تکتا رہتا ہے، سیئون مل، نیومل، اولڈ مل، پوار مل،
ج مل۔ لیکن اس کے لئے کسی مل میں جگہ نہیں ہے۔ کیونکہ مزدور کو گالی کھانے
ہے اگالی دینے کا حق نہیں ہے۔ آج کل لڑیا بازاروں اور گلیوں میں آوازیں دیکر
ترکاری فروخت کرتی ہے اور گھر کا سارا کام کاج بھی کرتی ہے۔ اس نے بیڑی،
، سب چھوڑ دی ہے ہاں اس کی ساڑھی، قرمزی بھورے رنگ کی ساڑھی
جگہ سے پھٹتی جا رہی ہے۔ تھوڑے دنوں تک اور اگر جھبو کو کام نہ ملا تو لڑیا کو اپنی
، میں پرانی ساڑھی کے ٹکڑے جوڑنا پڑیں گے، اور اپنے میاں جھبو کو بیڑی
بند کرنا پڑے گا۔
پانچویں ساڑھی کا کنارہ گھبرا نیلا ہے، ساڑھی کا رنگ گہرا سُرخ ہے۔ لیکن

کنارا گہرا نیلا ہے۔ اور اس نیلے میں اب بھی کہیں کہیں چمک باقی ہے۔ یہ ساڑھی دوسر
ساڑھیوں سے بڑھیا ہے۔ کیونکہ یہ ساڑھی پانچ روپے چار آنے کی نہیں ہے
کا کپڑا، اس کی چمک دمک کہے دیتی ہے کہ یہ ان سے ذرا مختلف ہے۔ آپ کو د
یہ مختلف معلوم نہیں ہوتی ہوگی۔ مگر میں جانتا ہوں کہ یہ اُن سے ذرا مختلف ہے۔ ا
کپڑا بہتر ہے۔ اس کا کنارا چمکدار ہے۔ اس کی قیمت پونے روپے ہے۔ یہ ساڑھی
کی ہے، یہ ساڑھی منجولا کی ہے، یہ ساڑھی منجولا کے بیاہ کی ہے۔ منجولا کے بیاہ
ابھی چھ ماہ بھی نہیں ہوئے ہیں۔ اس کا خاوند گزشتہ ماہ چرخی کے گھومتے ہوئے پٹے
لپیٹ میں آگے مارا گیا تھا۔ اور اب سولہ برس کی خوب صورت منجولا بیوہ ہے۔
کا دل جوان ہے، اس کا جسم جوان ہے، اس کی امنگیں جوان ہیں۔ لیکن اب وہ
نہیں کر سکتی۔ کیونکہ اس کا خاوند مل کے ایک حادثہ میں مر گیا ہے۔ وہ پٹہ بڑا دُ
تھا اور گھومتے ہوئے بار بار چپٹ پٹاتا تھا اور کام کرنے والوں کے احتجاج کے با
اُسے مل مالکوں نے نہیں بدلا تھا۔ کیونکہ کام چل رہا تھا اور دوسری صورت میں
تھوڑی دیر کے لئے کام بند کرنا پڑتا۔ پٹہ کو تبدیل کرنے کے لئے روپیہ بھی خرچ ہو
تھا۔ مزدور تو کسی وقت بھی تبدیل کیا جا سکتا ہے، اُس کے لئے روپیہ تھوڑی خر
ہوتا ہے، لیکن پٹہ تو بڑی قیمتی شے ہے۔

جب منجولا کا خاوند مارا گیا، تو منجولا نے ہرجانے کی درخواست دی، جو نامنظ
ہوئی۔ کیونکہ منجولا کا خاوند اپنی غفلت سے مرا تھا۔ اس لئے منجولا کو کوئی ہرجانہ نہ
اور وہ اپنی وہی نئی دلہن کی ساڑھی پہنے رہی جو اس کے خاوند نے پونے نو روپے
میں اس کے لئے خرید کی تھی کیونکہ اس کے پاس کوئی دوسری ساڑھی نہ تھی جو وہ اپنے
خاوند کی موت کے سوگ میں پہن سکتی۔ وہ اپنے خاوند کے مرجانے کے بعد بھی دلہن کا لبا
پہننے پر مجبور تھی۔ کیونکہ اس کے پاس کوئی دوسری ساڑھی نہ تھی اور جو ساڑھی تھی وہ

لے سُرخ رنگ کی پونے نو روپے کی ساڑھی جس کا رنگ گہرا نیلا ہے۔

شاید اب منجولا بھی پانچ روپے چار آنے کی ساڑھی پہنے گی۔ اس کا خاوند زندہ رہتا
بھی وہ دوسری ساڑھی پانچ روپے چار آنے کی لاتی۔ اس لحاظ سے اس کی زندگی میں
خاص فرق نہیں آیا۔ مگر فرق اتنا ضرور ہوا ہے کہ وہ یہ ساڑھی آج پہننا چاہتی ہے
سفید ساڑھی پانچ روپے چار آنے والی جسے پہن کر وہ دلہن بنیں ہیں وہ معلوم ہو سکے
ڑھی اسے دن رات کاٹ کھانے کو دوڑتی ہے اس ساڑھی سے جیسے اس کے مرحوم
ند کی مضبوط باہیں لپٹی ہیں۔ جیسے اس کے ہر تار پر اُس کے شفاف بوسے مرقسم ہیں۔
ے اُس کے تانے بانے میں اس کے خاوند کی گرم گرم سانسوں کی حدّت آمیز غنودگی ہے۔
کے سیاہ بالوں والی چھاتی کا سارا پیار دفن ہے۔ جیسے اب یہ ساڑھی نہیں ہے۔
گہری قبر ہے، جس کی ہولناک پہنائیوں کو وہ ہر وقت اپنے جسم کے گرد لپیٹ لیتے
ر ہے۔ منجولا زندہ قبر میں گاڑی جا رہی ہے۔

چھٹی ساڑھی کا رنگ لال ہے۔ لیکن اسے یہاں نہیں ہونا چاہیئے، کیونکہ اسے پہننے
ر چکی ہے، پھر بھی یہ ساڑھی یہاں جنگلے پر بدستور موجود ہے۔ روز کی طرح دھلی دھلائی
ں جھول رہی ہے۔ یہ مائی کی ساڑھی ہے جو ہماری چال کے دروازے کے قریب اندر
آنگن میں رہا کرتی تھی۔ مائی کا ایک بیٹا تھا۔ سیتو، وہ اب جیل میں ہے، بال سیتو
د ی اور اس کا لڑکا یہیں نیچے آنگن میں دروازے کے قریب دیوار کے نیچے پڑے
ہتے ہیں۔ سیتو اور سیتو کی بیوی اور اس کی لڑکی اور بڑھیا مائی یہ سب لوگ ہماری
کے بھنگی ہیں۔ ان کے لئے کھولی بھی نہیں ہے اور ان کے لئے اتنا کھاتا کپڑا بھی نہیں ملتا
ہم لوگوں کو ملتا ہے۔ اس لئے یہ لوگ آنگن میں رہتے ہیں، وہیں کھانا پکاتے ہیں
پڑ کے سو رہتے ہیں۔ یہیں یہ بڑھیا مائی ماری گئی تھی۔ وہ بڑا سوراخ جو آپ اس
ھی میں دیکھ رہے ہیں پلو کے قریب، یہ گولی کا سوراخ کا ہے، یہ کارتوس کی گولی

مائی کو بھنگیوں کے ہڑتال کے دنوں میں لگی تھی۔ نہیں، وہ اس ہڑتال میں حصہ
لے رہی تھی، وہ بیچاری تو بہت بوڑھی تھی، چل پھر نہیں سکتی تھی۔ اس ہڑتال میں
کا بیٹا ستیو اور دوسرے بھنگی شامل تھے، یہ لوگ صفائی مانگتے تھے اور کھولی کا
مانگتے تھے، یعنی اپنی زندگی کے لئے دو وقت کا روٹی کپڑا، اور سر پر ایک چھت
تھے۔ اس لئے ان لوگوں نے ہڑتال کی تھی اور جب ہڑتال خلاف قانون دید
تو ان لوگوں نے جلوس نکالا اور اس جلوس میں مائی کا بیٹا ستیو آگے آگے تھا اور
زور و شور سے نعرے لگاتا تھا اور پھر جب جلوس بھی خلاف قانون قرار دید
تو گولی چلی اور ہماری چال کے سامنے چلی، ہم لوگوں نے تو اپنے دروازے بند کر
لیکن گھبراہٹ میں چال کا دروازہ بند کرنا کسی کو یاد نہ رہا اور پھر ہم اپنے بند کمرو
ایسا معلوم ہوا گویا گولی ادھر سے ادھر سے چاروں طرف سے چل رہی ہو، تھو
کے بعد بالکل سناٹا ہو گیا اور جب ہم لوگوں نے ڈرتے ڈرتے دروازہ کھولا اور
جھانک کے دیکھا تو جلوس تتر بتر ہو چکا تھا اور ہماری چال کے دروازے کے
بڑھیا مری پڑی تھی۔ یہ اُسی بڑھیا کی لال ساڑھی ہے۔ جس کا بیٹا ستیو اب جیل
اس لال ساڑھی کو اب بڑھیا کی بہو پہنتی ہے۔ اس ساڑھی کو بڑھیا کے ساتھ جلا
تھا، مگر کیا جائے تن ڈھکنا زیادہ ضروری ہے۔ مردوں کی عزت و احترام سے
کہیں زیادہ ضروری ہے کہ زندوں کا تن ڈھکا جائے۔ یہ ساڑھی جلنے جلا
لئے نہیں ہے، تن ڈھکنے کے لئے ہے۔ ہاں کبھی کبھی ستیو کی بیوی اس کے پلو
اپنے آنسو پونچھ لیتی ہے، کیونکہ اس میں پچھلے اسی برسوں کے سارے آنسو اور
امنگیں اور ساری فتحیں اور شکستیں جذب ہیں، آنسو پونچھ کر ستیو کی بیوی پھر ا
ہمت سے کام کرنے لگتی ہے جیسے کچھ ہوا ہی نہیں، کہیں گولی نہیں چلی کوئی جی
نہیں گیا، بھنگن کی جھاڑو اسی طرح چل رہی ہے۔

ایلو، باتوں باتوں میں وزیر اعظم صاحب کی گاڑی نکل گئی۔ وہ یہاں نہیں ٹھہری۔ میں سمجھتا تھا وہ یہاں ضرور ٹھہرے گی۔ وزیر اعظم صاحب درشن دینے کے لیے گاڑی سے نکل کے تھوڑی دیر کے لئے پلیٹ فارم پر ٹہلیں گے اور شاید ہوا میں جھولتی ہوئی ان چھ ساڑھیوں کو بھی دیکھ لیں گے جو دھابکشی کے پُل کے بائیں طرف لٹک رہی ہیں۔ یہ چھ ساڑھیاں جو بہت ہی معمولی عورتوں کی ساڑھیاں ہیں ایسی معمولی معمولی عورتیں جن سے ہمارے دیس کے چھوٹے چھوٹے گھر بنتے ہیں جہاں ایک کونہ میں چولھا سلگتا ہے، ایک کونے میں پانی کا گھڑا رکھا ہے، ادھر طاقچے میں شیشہ ہے، کنگھی ہے، سیندور کی ڈبیہ ہے، کھاٹ پر ننھا بچہ سو رہا ہے۔ الگنی پر کپڑے سوکھ رہے ہیں۔ یہ ان چھوٹے چھوٹے لاکھوں کروڑوں گھروں کو بنانے والی عورتوں کی ساڑھیاں ہیں جنہیں ہم ہندوستان کہتے ہیں۔ یہ عورتیں جو ہمارے پیارے پیارے بچوں کی مائیں ہیں، ہمارے بھولے بھائیوں کی عزیز بہنیں ہیں، ہماری معصوم محبتوں کا گیت ہیں، ہماری پانچ ہزار سالہ تہذیب کا سب سے اونچا نشان ہیں۔ وزیر اعظم صاحب، یہ ہوا میں جھولتی ہوئی ساڑھیاں تم سے کچھ کہنا چاہتی ہیں۔ تم سے کچھ مانگتی ہیں۔ یہ کوئی بہت بڑی قیمتی چیز تم سے نہیں مانگتی ہیں، یہ کوئی بڑا ملک، کوئی بڑا عہدہ، کوئی بڑی موٹر کار، کوئی پرمٹ، کوئی ٹھیکہ، کوئی پرائیوٹ۔ یہ ایسی کسی چیز کی تم سے طالب نہیں ہیں، یہ تو زندگی کی بہت ہی چھوٹی چھوٹی چیزیں مانگتی ہیں۔ دیکھئے! یہ شانتا بائی کی ساڑھی ہے جو اپنے بچپن کی کھوئی ہوئی دھنک تم سے مانگتی ہے۔ یہ جیونا بائی کی ساڑھی ہے، جو اپنی آنکھ کی روشنی اور اپنی بیٹی کی عزت مانگتی ہے۔ یہ ساوتری کی ساڑھی ہے۔ جس کے بچے مر چکے ہیں اور جس کے پاس اپنے بچوں کے لئے اسکول کی فیس نہیں ہے۔ یہ لڑیا ہے، جس کا خاوند بیکار ہے اور جس کے کمرے میں ایک طوطا ہے۔ جو دو دن سے بھوکا ہے۔ یہ نئی دلہن کی ساڑھی

ہے، جس کے خاوند کی زندگی چمڑے کے ٹکڑے سے بھی کم قیمت ہے یہ بڑی بھنگن کی لال ساڑھی ہے جو بندوق کی گولی کو ہل کی پھال میں تبدیل کرنا چاہتی ہے تاکہ دھرتی سے انسان کا لہو پھول بن کر کھل اُٹھے اور گندم کے سنہرے خوشے ہنسکر لہرانے لگے۔

لیکن وزیر اعظم صاحب کی گاڑی نہیں رُکی اور وہ ان چھ ساڑھیوں کو نہیں دیکھ سکے۔ اور تقریر کرنے کے لئے چھ پاٹی چلے گئے، اس لئے اب میں آپ سے کہتا ہوں کہ اگر کبھی آپ کی گاڑی اُدھر سے گزرے تو آپ ان چھ ساڑھیوں کو ضرور دیکھئے۔ جو بہا لکشمی کے پل کے بائیں طرف لٹک رہی ہیں اور پھر آپ ان رنگا رنگ ریشمی ساڑھیوں کو بھی دیکھئے جنہیں دھوبیوں نے اسی پل کے دائیں طرف سوکھنے کے لئے لٹکا رکھا ہے۔ اور جو ان گھروں سے آئی ہیں جہاں اونچی اونچی چمنیوں والے کارخانوں کے مالک یا اونچی اونچی تنخواہوں کے پانے والے رہتے ہیں۔ آپ اس پل کے دائیں بائیں دونوں طرف ضرور دیکھئے اور پھر اپنے آپ سے پوچھئے کہ آپ کس طرف جانا چاہتے ہیں۔ دیکھئے! میں آپ سے اشتراکی بننے کے لئے نہیں کہہ رہا ہوں۔ میں آپ کو جماعتی جنگ کی تلقین بھی نہیں کر رہا ہوں، میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ آپ بہا لکشمی پل کے دائیں طرف ہیں یا بائیں طرف؟

مچھلی جال

گاؤں سویا ہُوا تھا۔ بھورے بھورے مچھلی جال دھوپ میں سوکھنے کے لئے لکڑی کی اونچی کھمچیوں پر تنے ہوئے تھے اور ان کی شطرنجی سائے میں بڈھے ماہی گیر سو رہے تھے۔ ساحل کی ریت میں آدھے سے زیادہ اندر دھنسا ہُوا سفید شوالہ اپنے کلس پر سفید جھنڈا لہرا رہا تھا، اونچے ٹیلے پر ناریل کا درخت تھا۔ جہاں ایک گدھا چپ چاپ کھڑا تھا۔ اس سے پرے باڑھ تھی۔ جس کے اندر ناریل کا جھنڈ تھا۔ جو دور تک اندر گاؤں میں چلا گیا تھا۔ اور جس نے ماہی گیروں کے جھونپڑوں کو نظر سے اوجھل کر دیا تھا۔

یہاں ساحل کے کنارے کی ریت کس قدر خنک اور نرم تھی۔ ساحل سے جتنا دُور جاؤ، ریت گرم اور سخت ہوتی جاتی تھی۔ اور ٹیلوں کے کنارے جہاں سمندری جھاگ سوکھ گیا تھا۔ اور چھوٹی چھوٹی مہین سیپیوں اور سنکھوں کی قطار لگی ہوتی تھی۔ وہاں کی ریت پر پاؤں رکھنے سے پتلے کانچ کے ٹوٹنے کی آواز پیدا ہوتی تھی، اور پاؤں اک عجیب گدگدا دینے والی کرکری لذت سے آشنا ہوتے تھے، کل دیر تک ان ٹیلوں کے کنارے چلتا رہا۔ اور اس لذت کے مزے لیتا رہا۔ اور بے فکری سے چاروں طرف دیکھتا رہا۔ اور چلتے چلتے بیچ میں رک رک کر خوبصورت سیپیاں، گھونگھے اور سنکھ جمع کرتا رہا۔ ساحل ایک نیم دائرے کی صورت میں بہت دور تک پھیلا ہُوا تھا۔ اس نیم دائرے کے سرے پر یہ گاؤں تھا۔ دوسرے سرے

پر اس کا اپنا گاؤں، بیچ میں یہ لمبا کٹا پھٹا ساحل تھا، اور اونچے اونچے ٹیلوں سے بھرا ہوا، گل چلے چلتے یکایک ٹھٹک گیا۔ ایک بڑے ٹیلے کی اوٹ میں ایک کشتی اوندھے منہ پڑی تھی، اور اس کے قریب ایک لڑکی اوندھے منہ لیٹی تھی۔ گل نے اسے سر سے پاؤں تک دیکھا۔ اس نے اس لڑکی کے ننھے ننھے پاؤں سرخ مہندی میں رچے ہوئے دیکھے۔ اس نے اس کے سیاہ ابرق کی طرح چمکتے ہوئے جوڑے میں گل شفق کا ایک بہت بڑا پھول دیکھا۔ جس کی رنگت بالکل سونے کی طرح تھی۔ ایک بات کھوڑی کے نیچے تھا۔ دوسرا بات ساحل کی ریت پر پڑا تھا۔ گل نے اس بات کی چوڑیاں گنیں، گہرے سرخ کانچ کی سات چوڑیاں تھیں۔ لیکن اب کے اسے یہ بات بہت خوب صورت معلوم ہوئی۔ اس نے یہ بات دیکھا۔ رخساروں پر سوئی ہوئی پلکوں کی آراستہ صف کو دیکھا۔ ان ننھے ننھے نتھنوں کو دیکھا سانس کی لہروں سے باریک سیپوں کی طرح ہل رہے تھے اور پھر اس بات کو دیکھا جو اس کی طرف پھیلا ہوا ساحل کی ریت پر پڑا تھا، اور جس کی کلائی میں سات چوڑیاں تھیں۔ اور وہ ہیں ریت میں قریب بیٹھ گیا، اور کانچ کی ابھی ہوئی چوڑیوں کو الگ الگ کرنے لگا۔

"ہٹو مجھے سونے دو" لڑکی نے اسی طرح لیٹے لیٹے ہلے جلے بغیر کہا اور گل ایک لمحے کے لئے چونک کر اچھل پڑا۔ اس کا خیال تھا کہ لڑکی سو رہی ہے۔ لڑکی نے پھر کہا "تم کب سے یہاں کھڑے ہو" میں نے سوچا تم آپ ہی آپ چلے جاؤ گے مجھے دیکھ کر، اب تو چلے جاؤ۔ مجھے نیند آ رہی ہے۔ دیکھو کتنی اچھی دھوپ ہے اف ..... اف ..... ام" لڑکی نے اب اپنے بازو ریت پر پھیلا دیئے اور اپنی طرف سے خوب جم کر سو گئی۔

گل نے اس کے جوڑے میں سجے ہوئے سنہرے پھول کو دیکھا اور پھر

کانچ کی چوڑیاں گننے لگا۔ جب پوری سات گن چکا، تو اس نے آہستہ سے اس کے جوڑے سے گوہ پھول نکال لیا۔

وہ لڑکی پھر اسی طرح لیٹے لیٹے بولی " تم ابھی تک نہیں گئے "۔

گل نے کہا۔ " میں تمھارے لئے شفق کا پھول لایا ہوں۔ دیکھو "۔

لڑکی چونک کر اُٹھ بیٹھی۔ بے اختیار اس کا ہات اپنے جوڑے پر گیا۔ گل کا خیال ٹھیک نکلا۔ لڑکی بہت خوب صورت تھی۔

لڑکی نے کہا " لاؤ میرا پھول مجھے دے دو "۔

گل نے پھول آگے بڑھایا۔

لڑکی نے ہات آگے بڑھایا۔

گل نے پھول پیچھے ہٹا کے کہا " اُنھوں۔ ایسے نہیں۔ میں اسے خود تمہارے جوڑے میں لگاؤں گا "۔

" نہیں "۔ لڑکی نے بڑی سختی سے کہا۔

" نہیں ؟ تو اچھا میں چلتا ہوں، خدا حافظ "۔

گل پھول اپنے ہات میں لئے دو قدم چلا۔ لڑکی نے کہا۔ اچھا آجاؤ۔

وہ اپنے جوڑے میں پھول لگوانے کے لئے ایک بت کی طرح اکڑ کر بیٹھ گئی اس سے اس کے سینے کا اُبھار اور بھی تن گیا اور کمر کا خم اور بھی نمایاں ہو گیا۔ اور گل نے سوچا۔ اس لڑکی کا نام ضرور پوچھنا چاہیئے۔ اس نے جوڑے میں پھول لگاتے ہوئے کہا " تمھارا نام کیا ہے ؟ "۔

" ہم نہیں جانتے "..... لڑکی نے کہا۔

" کیوں نہیں جانتے ؟ "

" میں نہیں بتاؤں گی "۔

"کیوں نہیں بتاؤ گی؟"

لڑکی نے غصے سے ہات اپنے سینے پر رکھ لئے اور کہا "اب تم چلے جاؤ۔ یہ سامنے ٹیلے پر میرا گاؤں ہے۔ ابھی شور مچاؤں گی تو اتنے لوگ جمع ہو جائیں گے کہ تمہارے جسم پر گوشت کا ایک ٹکا بھی نہیں ملے گا۔ یہ تمھارا جسم جو اس وقت سمندری مچھلی کی طرح پلا ہوا دکھائی دے رہا ہے۔ اس میں صرف مچھلی کا کانٹا رہ جائے گا۔"

پھول جو رٹے بیں بچ گیا۔

لڑکی نے ہنس کر کہا" مگر مجھے یہ بھی تو معلوم نہیں کہ تمہارے اندر وہ مچھلی کا کانٹا بھی ہے کہ نہیں۔ بغیر کانٹے کے بھی تو مچھلیاں ہوتی ہیں نا۔"

گل نے یکایک اسے اپنے مضبوط بازوؤں کی گرفت میں لے لیا۔ لڑکی تڑپ کر اچھلی اور اس کا ہات زور سے گل کے رخسار پر پڑا۔ گل نے فوراً ایک ہات لڑکی کے منہ پر رکھ دیا۔ اور وہ دونوں لڑنے لگے۔ لڑکی اس کی گرفت سے آزاد ہونا چاہتی تھی اور وہ زور زور سے چلانا چاہتی تھی۔ مگر گل کی گرفت بڑی مضبوط تھی۔ اور اس کا دوسرا ہات بڑی سختی سے اس کے منہ پر جا ہوا تھا گل کو معلوم تھا کہ اس نے لڑکی کو چیخ کا موقعہ دیا تو اس کی جان کی خیر نہیں یکایک اسے معلوم ہوا کہ لڑکی اس کی گرفت سے نکلی جا رہی ہے۔ وہ دونوں بازوؤں سے لڑ رہی تھی، اور گل صرف ایک بازو سے کام لے رہا تھا۔ اور وہ دونوں لڑتے لڑتے بالکل کشتی کے قریب چلے گئے، لڑکی نے کوشش کرکے دونوں ہاتھوں سے گل کا ایک ہات پیچھے مروڑ دیا۔ اب ایک طرف کشتی تھی، گل ادھر مڑ نہ سکتا تھا۔ دوسری طرف ٹیلہ تھا۔ بیچ میں گل پھنس گیا تھا۔ لڑکی نے کوشش کر کے اپنا منہ پر سے ہٹا لیا۔ بولی" اب بتاؤ" اس نے گل کے منہ پر دو گھونسے

دیئے، گل تڑپ کر اپنے مروڑے ہوئے ہات پر زور دے کر جو اٹھا تو ادھی کشتی کی کیل چبھ گئی تھی۔ مگر اس نے ہنس کر کروٹ بدل ڈالی۔ اب لڑکی ریت پر گر گئی۔ اور اس کے دونوں بازو گل کی گرفت میں تھے اور گل نے اپنے ہونٹوں کو اس کے ہونٹوں کے بالکل قریب لیجا کے کہا۔ "اب کہو"۔

لڑکی کے ہونٹ یوں پھڑک رہے تھے جیسے مچھلی بہت چھلے پانی میں ہانپتی ہے۔ اس نے اپنے ہونٹ اس کے ہونٹوں سے ملا دیئے ایک بار دوبار پھر اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے مچھلی بہت گہرے پانیوں میں پہنچ گئی۔ جہاں بالکل سکون ہے۔ اور امن ہے اور چین ہے اور وہ دونوں گہرے سبز پانیوں میں ایک دوسرے سے جل پریوں کی طرح لپٹے ہوئے آنکھیں بند کئے ہونٹ سے ہونٹ ملائے تیرتے چلے جا رہے ہیں اور ان کے ارد گرد خوب صورت طلائی مچھلیاں گھوم رہی ہیں۔ اور مونگے کی خوشنما آبی جزیروں میں اسفنج حیرت سے اپنی آنکھیں کھولے ان کی طرف تک رہے ہیں اور نازک چھریرے آبی پودوں کی ریشمی ڈالیاں آہستہ آہستہ مسرت سے ہل رہی ہیں اور ان کے جسم آپ ہی آپ ڈولتے ہوئے سبز و سیاہ پتوں کے چھوٹے بن جھولتے ہوئے ریشمی ڈالیوں کو چھوتے ہوئے تیرتے ہوئے ان خوش رنگ محلوں کی طرف جا رہے ہیں جہاں سیپیوں میں خوب صورت موتی رہتے ہیں۔ اور رنگا رنگ کے گھونگھے اور سنکھ اپنے مرمریں دروازوں سے باہر جھانک کر دیکھتے ہیں۔ جس کے دور اُوپر کہیں سمندر کے روشندان سے نیلی نیلی مدھم مدھم شعاعیں جھلمل جھلمل کرتی ہوئی آ رہی ہیں۔

لڑکی نے ایک گہرا سانس لیا۔ اور اس کے ہاتھ کی مٹھیاں آپ ہی آپ کھلتی گئیں۔

گل نے آہستہ سے پوچھا۔ "تمہارا نام کیا ہے؟"
"مہر" لڑکی نے بڑی کمزور آواز میں جواب دیا۔
"میرا نام گل ہے"۔ اس نے آہستہ سے کہا۔
گل؟..... گل!..... لڑکی کے کانپتے ہوئے ہونٹ کہنے لگے..... گل مہر۔
"نہیں۔ مہر گل" گل نے جواب دیا اور لڑکی کو سہارا دیکر اُٹھایا۔
لڑکی بولی۔ "تم کیا کرتے ہو، کہاں رہتے ہو؟"
گل نے کہا "میں وہ سامنے کے گاؤں میں رہتا ہوں اور مصیرا تیار کرتا ہوں"
"مصیرا کیا ہوتا ہے؟"
گل نے کہا۔ "مصیرا ایک قسم کی شراب ہوتی ہے۔ بالکل ایسی جیسے تمہارے ہونٹوں میں ہوتی ہے۔ نرم۔ گرم۔ پاکیزہ۔ لطیف۔ میٹھی میٹھی چاشنی لئے ....."
مہر نے کہا۔ "اگر تم نے کوئی شرارت کی تو میں واقعی گاؤں والوں کو بلا لوں گی"
گل ہنسا۔ کہنے لگا "میں سب جانتا ہوں۔ گاؤں والے ہیں کہاں وہ سب مچھلی پکڑنے گئے ہیں"
مہر نے کہا "تم مصیرا کیوں بناتے ہو۔ مچھلیاں کیوں نہیں پکڑتے؟"
گل نے کہا۔ میں مصیرا تیار کرتا ہوں۔ ماہی گیر مچھلیاں پکڑتے ہیں اور پھر ایک ہی جگہ دسترخوان پر یہ دونوں چیزیں اکٹھی ہو جاتی ہیں۔ مچھلی اور مصیرا

..... گل اور مہر .....

مہر ذرا پرے سرک گئی۔ بولی دیکھو میں تم سے کہتی ہوں۔ میرے قریب مت آؤ، تم نہیں جانتے میں کتنی خطرناک لڑکی ہوں۔

گل نے پوچھا۔ کتنی خطرناک ہو۔؟

مہر نے کہا۔ میرے لئے تین خون ہو چکے ہیں، اب تک۔

گل نے کہا۔ تو اب چوتھے کی تیاری سمجھو۔

مہر نے کہا۔ لوگ کہتے ہیں۔ کہ میں دُنیا کی سب سے خوب صورت لڑکی ہوں۔

گل نے کہا۔ ہر گاؤں میں ایک ایسی لڑکی ہوتی ہے جو دُنیا کی سب سے خوب صورت لڑکی ہوتی ہے۔ اور ہر لڑکی جب پہلی بار انگڑائی لیتی ہے، دُنیا کی سب سے خوبصورت لڑکی بن جاتی ہے۔ لیکن خوب صورتی میں میری محبوبہ کا جواب نہیں ہے۔

"کون ہے وہ" مہر نے آنکھیں چمکا کے پوچھا۔

"مصیرا" گل نے ہنستے ہوئے کہا۔

مہر نے کہا۔ تمہارا کام اچھا نہیں ہے۔ اسے چھوڑ دو۔

تو کیا کروں؟

مچھلیاں پکڑا کرو۔

گل نے مہر کی کمر میں ہات ڈال دیا۔

مہر نے اس کا ہات پکڑتے ہوئے۔ "کیا کر رہے ہو"

"مچھلی پکڑ رہا ہوں" گل نے جواب دیا۔

مہر ہنسنے لگی۔ ہنستے ہنستے بولی۔ میں کس آفت میں پھنس گئی، میرا منگیتر اس

وقت مجھے دیکھ لے تو جان سے مار ڈالے۔

تمہارا منگیتر بھی ہے؟

ہاں اس کا نام عبدل ہے۔

عبدل کیا بہت خوف ناک آدمی ہے۔

ہاں سارے گاؤں میں اس جیسا تگڑا جوان نہیں ہے ..... مگر مہر نے گل کی طرف دیکھتے ہوئے بڑے رشک سے کہا۔ وہ تمہاری طرح خوب صورت نہیں ہے اور اتنا کہہ کر مہر نے گل کے سر میں بہت ساری ریت ڈال دی، گل اپنے بالوں کو جھٹک کر کہنے لگا۔ میں عبدل سے ملنا چاہتا ہوں۔

مہر نے کہا۔ وہ تمہیں جان سے مار ڈالے گا۔

گل نے کہا۔ اسی لئے ملنا چاہتا ہوں۔

مہر نے کہا۔ میں جانتی ہوں تم اس سے ملے بغیر اب نہیں رہو گے اور پھر تمہاری لاش سمندر کے گہرے پانی میں مچھلیاں کھا جائیں گی۔

گل نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس نے اپنے پاؤں ریت میں گاڑ دیئے، اور گھونگھے اور خالی سیپیاں اکٹھی کر کے گھروندا بنانے لگا۔ پھر مہر نے بھی اپنے خالی پاؤں ریت میں ڈبو دیئے اور اپنا چھوٹا سا گھروندا بنانے لگی، گھروندا بنانے میں وہ بڑی مشتاق معلوم ہوتی تھی۔ بہت جلد اس نے ایک خوبصورت سا ریت کا محل تعمیر کر لیا۔ اس کی پتلی پتلی انگلیاں بڑی تیزی سے چل رہی تھیں۔ گل انہیں دیکھتا ہی رہ گیا اور اس کا اپنا گھروندا نامکمل رہ گیا۔ اور جب مہر کا گھروندا بن گیا تو اس نے بھی جلدی جلدی اپنے موٹے گھردرے بڑے بڑے ہاتھوں سے ایک بے ڈول اور بے ڈھنگا سا گھروندا تیار کیا جو خوب صورت محل کے بجائے ایک بدنما تاریک غار معلوم ہو رہا تھا۔

مہر نے گل کے گھروندے کو لات مار کے کہا۔ اونہہ یہ بھی کوئی گھروندا ہے۔ گل کا گھروندا ڈھے گیا۔ اس نے مہر کے گھروندے کو لات مار دی اور کہا اونہہ، یہ بہت اچھا ہے؟

مہر نے پھر گل کو بالوں سے پکڑ لیا۔ اور بہت ساری ریت اس کے سر پر ڈال دی، اور ریت اس کے سر میں اس کے کانوں میں اس کی آنکھوں میں، اس کے نتھنوں میں اس کے منہ میں چلی گئی اور اس نے اسی حالت میں بالوں کو ایک بار جھٹک کر مہر کو پکڑ لیا۔ اب کے ان رسیلے ہونٹوں کا مزا ہی کچھ عجیب تھا رگ رگ میں نس نس میں ریت کے خوشگوار ذرے اک عجیب گدگدی سی پیدا کر رہے تھے۔

یکایک دور سمندر کے پانیوں سے گانے کی آواز آئی۔ مہر نے پلٹ کے دیکھا۔ ساحل کے نیم دائرے کے مغربی کونے پر ایک بادبان والی کشتی نمودار ہو چکی تھی۔ مہر نے کشتی پہچان کے کہا " عبدل آ گیا "۔

گل کے بازو تن گئے۔ بولا۔ اچھا ہے۔

نہیں تم چلے جاؤ۔

نہیں!

دیکھو میں کہتی ہوں، اس وقت ٹھیک نہیں ہے۔ میں اب خون خرابا نہیں چاہتی۔

نہیں۔

مہر نے گل کی ٹھوڑی کو ہاتھ لگا کے کہا۔ مہر آج تک کسی کی نہ ہو سکی۔ مگر آج سے وہ تمہاری ہو جائے گی ....

گل مہر کی طرف دیر تک دیکھتا رہا۔ بولا۔ سچ کہتی ہو؟

مہر نے کہا دیکھ لینا، اب تم جاؤ۔

گل نے اُٹھتے ہوئے کہا۔ پھر کب ملوگی؟

کل ملوں گی، قبرستان کے پیچھے ناریل کا جو جھنڈ ہے نا۔ وہاں میرا انتظار کرنا۔ جب چاند ٹھیک جھنڈ کے اوپر پہنچ جائے گا۔ میں آجاؤں گی۔

گل اُٹھ کے چلا گیا۔ دُور کی کشتی نزدیک آتی گئی اور نزدیک سے جانے والا دُور ہوتا گیا آنے والی کشتی کنارے سے آلگی اور جانے والا ایک نقطہ بن کر غائب ہوگیا۔ مہر نے ایک لمبی سانس لی۔ کوئی ساحل کے پتلے پانیوں میں چلتا ہوا اس کی طرف آرہا تھا۔ مہر وہیں بیٹھی رہی بڑے بڑے پاؤں مضبوط ٹانگیں، چلتی ہوئی اس کے بالکل قریب آکے رک گئیں مہر اُٹھ کھڑی ہوئی اور عبدل کی طرف دیکھنے لگی عبدل نے صرف ایک نیکر پہن رکھی تھی۔ دھوپ میں اس کا سیاہ جسم ایک خوب صورت تلوار کی طرح چمک رہا تھا۔ اس کے ٹھنے پھیلے ہوئے تھے۔ رُخسار اُبھرے ہوئے تھے۔ اور آنکھیں تنگ گڑھوں میں چمکتی تھیں۔ عبدل نے ٹوٹے ہوئے گھروندوں کو دیکھا اور پوچھا یہ کون تھا!

مہر نے بڑی لاپرواہی سے جواب دیا۔ ایک اجنبی تھا۔

عبدل نے بڑی سختی سے مہر کا ہاتھ پکڑ لیا۔

مہر نے زور سے عبدل کا ہاتھ جھٹک دیا۔ اور آگے بڑھ کر گاؤں کی طرف چلنے لگی۔ تھوڑی دیر کے لئے عبدل اسے گھورتا رہا۔ پھر مسکرا کر اس کے پیچھے پیچھے ہولیا۔

یوں تو ساری دُنیا چاند کو ناریل کے جھنڈ پر اٹکتا ہوا دیکھ کر خوش ہوتی ہے۔ لیکن یہ انتظار کرنے والے ہی جانتے ہیں کہ چاند کتنی دیر میں ناریل کے جھنڈ کے اوپر پہنچتا ہے۔ وہ جامن کے پیڑ میں جلدی پہنچ جاتا ہے، پیڑوں کی ڈالیوں میں پہنچتے ہوئے اسے زیادہ دیر نہیں لگتی۔ آم کی شاخوں میں پہنچتے ہوئے اسے

زیادہ وقت نہیں لگتا۔ لیکن جب وہ ان سب درختوں سے اونچا ہو کے ناریل کے جھنڈ پہ
پہنچتا ہے۔ تو رات آدھی سے زیادہ گزر جاتی ہے لوگ سو جاتے ہیں گھروں کی روشنیاں
بجھ جاتی ہیں۔ ماہی گیروں کے سمندری گیت چپ ہو جاتے ہیں۔ چاروں طرف سناٹا چھا
جاتا ہے، اور اس سناٹے میں صرف چنبیلی کی خوشبو رہتی ہے اور سمندر کی گونج بہتی ہے
اور چاندنی کی لے بہتی ہے۔ اور اس خوشبو میں اس گونج میں، اس لے میں سارا
جہاں سو جاتا ہے۔ ساحل کے ٹیلوں کی چمکتی ہوئی ریت کسی کا انتظار کرتے کرتے سو جاتی
ہے، اور پھر جا کے کہیں چاند اونچے ناریل کے جھنڈ میں آتا ہے اور کسی کے آہستہ
خرام، کنوارے پاؤں خشک پتوں میں زندگی جگاتے ہوئے چلے آتے ہیں۔ اور
کسی کا دھڑکتا ہوا سینہ کسی کے دھڑکتے ہوئے سینے سے لگ جاتا ہے اور کسی کے
انتظار کرتے ہوئے جلتے ہوئے ہونٹ کسی کے ٹھنڈے شیریں خنک ہونٹوں میں
مل جاتے ہیں۔ اور شانوں پر اور کانوں کے قریب اور گردن سے چھوتے ہوئے گھنے
بالوں کی گہری عطر بیز گلنار تاریکی دور تک روح اور جسم کے اندر کانپتے ہوئے سایوں
کی طرح بڑھتی چلی جاتی ہے اور کوئی آہستہ سے کہتا ہے کل۔ اور کوئی آہستہ سے جواب
دیتا ہے پھر۔ اور پھر کوئی کچھ نہیں کہتا۔ کوئی کچھ نہیں سنتا۔ چاروں طرف کا محیط
سناٹا دو دلوں کی دھڑکنوں کو، دو گہرے زمینی جذبوں کو، دو تیز تیز چلتے ہوئے
سانسوں کو محبت کے متبرک لوبان کے دھوئیں کی طرح چاندنی میں گھول دیتا ہے اور یہ
خوشبو اور یہ سناٹا اور یہ سمندر ایک گونج بن کر ان تاریک محلوں میں پہنچ جاتی ہیں، جہاں نرم
نازک، سیپیاں اپنا منہ کھولے محبت کے موتی کے انتظار میں ہیں اور خوش رنگ گھونگھے اپنے
خواب آور مرمریں گھروں سے نکل کر آبی پودوں کا سہارا لئے کھڑے ہیں۔ اور اس
لازوال روشنی کو دیکھ رہے ہیں جو دور اوپر سمندر کے روشندان سے کانپتی ناچتی تھرانی
نیلی نیلی جھلمل جھلمل کرتی ہوئی آ رہی ہے.........

چاند بہت زیر تک دور اوپر ناریل کے جھنڈ میں کسی شوخ حسینہ کے نقرئی آویزے کی طرح کانپتا رہا۔ اور دور نیچے وہ دونوں بہت دیر تک ایک دوسرے کی آغوش میں کانپتے رہے۔ پھر اک دم جیسے وہ کانپ کر ایک دوسرے سے الگ ہو گئے۔ کوئی اور بھی اس جھنڈ کی طرف چلا آ رہا تھا۔ وہ آتا ہوا تیز تیز غصیلے قدموں سے آگے بڑھتا ہوا چلا آ رہا تھا۔ اور وہ دونوں ایک دوسرے کا سہارا لئے ناریل کے تنے سے لگ گئے، اور ان کے چاروں طرف ناریل کے درخت کھڑے تھے۔ اور وہ سیاہ اجنبی غصے سے آگے بڑھتا ہوا چلا آ رہا تھا۔ یکایک جھنڈ کے ایک کھلے حصے میں سے اسے گزرتے ہوئے دیکھ کر مہر نے اسے پہچان لیا۔ اور اک دبی سی چیخ اس کے منہ سے نکل گئی اور پھر اس نے اپنے منہ پر ہات رکھ لیا۔ مگر عبدل نے وہ چیخ سن لی تھی اور اب وہ سیدھا انہی کی طرف آ رہا تھا۔ گل اسے اپنی طرف آتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ اور اپنے بازو تول رہا تھا۔ عبدل اب ایک کھلی جگہ میں تھا۔ جہاں چاروں طرف سے ناریل چھٹ سے گئے تھے۔ گل نے مہر کو چھوڑ دیا اور آگے بڑھ گیا۔ اس نے مہر کے ہات کی ایک ہلکی سی گرفت محسوس بھی کی۔ مگر وہ رکا نہیں آگے بڑھ گیا۔

اب دونوں ایک دوسرے کے سامنے تھے۔

بلا کچھ کہے سنے وہ ایک دوسرے سے گتھ گئے۔ کسی نے کوئی آواز نہیں نکالی۔ کوئی کسی سے بولا نہیں۔ کسی نے کسی کو مدد کے لئے نہیں پکارا۔ وہ دونو ایک دوسرے سے گتھ گئے، اور اپنے جسم و جان کی پوری طاقت سے لڑنے لگے۔ اور ان کے چاروں طرف خاموشی تھی اور ناریل کے درخت بھی خاموشی سے کھڑے یہ نظارہ دیکھ رہے تھے۔ اور مہر اپنی چھاتی پر ہات رکھے خاموشی سے یہ منظر دیکھ رہی تھی۔ اور وہ دونوں بڑی مستعدی سے بڑی خاموشی مگر بڑی خونخواری سے لڑ رہے تھے اور اس سناٹے میں صرف پتوں کے سرسرانے کی آواز آتی یا کہیں زمین پر کوئی سوکھی شاخ چٹخ جاتی۔

ورنہ مکمل خاموشی تھی۔ اور ان دونوں لڑنے والوں کی تیز تیز سانسیں۔ کبھی ایک ہوجاتا۔ کبھی دوسرا۔ گل کی داہنی آنکھ کے اوپر سے خون بہنے لگا۔ خون اس کے چہرے پر پھیلنے لگا اور وہ دونوں لڑتے گئے۔ آخر ایک داؤں میں عبدل بالکل بے بس ہوکر رہ گیا۔ وہ گل سے زیادہ تگڑا تھا۔ لیکن گل زیادہ پھرتیلا تھا۔ گل اس کی چھاتی پر چڑھ بیٹھا اور اس کا چہرہ چاندنی میں بجلی کی طرح چمکا۔ مگر مہر نے فوراً بڑی مضبوطی سے اس کا ہات پکڑ لیا۔ مہر کا اپنا ہات زخمی ہوگیا۔

مہر نے کہا، نہیں۔۔۔۔۔۔ اب چوتھا خون نہیں ہوگا۔ اس وقت اسے اپنی آواز بڑی عجیب معلوم ہوئی۔

گل عبدل کی چھاتی سے اُتر آیا۔ عبدل آہستہ آہستہ سے اُٹھا۔ گل چھرا ہات میں لئے عبدل کے قریب کھڑا اسے تاکتا رہا۔ عبدل نے ایک نظر مہر کی طرف دیکھا۔ ایسی مایوسی، ایسی حسرت سے دیکھا کہ مہر ان کی نگاہوں کی تاب نہ لاسکی۔ اس کی نگاہیں جھک گئیں، پھر عبدل نے گل کی طرف دیکھا اور اپنے ہاتوں کی طرف پھر اس کے بازو گر گئے۔ اور اس نے اپنی گردن اک عجب انداز میں ہلائی اور گھوم کر چلا گیا۔ وہ آہستہ آہستہ جارہا تھا۔ اور آہستہ آہستہ گل اور مہر اس کے پیچھے پیچھے مگر دور رہ کر چلنے لگے۔ عبدل گاؤں کی طرف نہیں گیا۔ وہ جھنڈ سے نکل کر شوالے کے نیچے ساحل کی طرف چلا گیا۔ تھوڑی دیر تک وہ ایک اونچے ٹیلے پر کھڑا رہا پھر اس نے گھوم کر مہر اور گل کو سلام کیا اور اچھل کر ساحل کے کنارے چلا گیا۔ یہاں اس نے ایک بادبان والی کشتی کھولی۔ جال کو سمیٹ کے کشتی میں رکھا۔ اور کشتی سمندر کے اندر لے گیا۔۔

مہر نے چلا کے کہا۔ ٹھہرو، ٹھہرو۔

کشتی دور ہوتی گئی، وہ چاندنی کے دھارے پر بہتی [illegible] تھی، سمندر کے بیچ

ہراہ بنی ہوئی تھی۔ یہ شاہراہ وہاں جاتی ہے جہاں چاند کا دیس ہے۔
بتوں اور الفتوں کا دیس، عبدل گاتا گاتا اسی شاہراہ پر ہولیا۔
نے کہا ٹھہرو........ ٹھہرو۔
ت کے سناٹے میں مہر کی آواز گونج گونج کر ٹوٹ گئی۔ اور پھر عبدل
ابھر آیا۔ یہ گیت اس مچھلی کا معلوم ہوتا تھا، جس کے گلے میں بنسی کا کانٹا پھنس
اور حلق سے نکلنے سے انکار کر دے۔
پھر رونے لگی۔
نے کہا۔ روتی کیوں ہو۔ وہ اپنے ساتھیوں میں مل گیا ہے۔ آج چاندنی رات
ج سارے گاؤں والے بیچ سمندر میں جا کے جال ڈالتے ہیں اور مچھلیاں پکڑتے
بح وہ سب کے ساتھ آجائے گا۔ دیکھ لینا۔
ن عبدل صبح کو سب کے ساتھ نہیں آیا۔ رات بھر وہ اپنے ساتھیوں کے
ھلیاں پکڑتا رہا۔ اور گیت گاتا رہا اور سب کو ہنساتا رہا۔ آج رات اس
ں میں بہت سی مچھلیاں آئیں۔ ڈھیروں کے ڈھیر۔ ایسی موٹی تازی خوبصورت
کہ ان ماہی گیروں نے بہت مدت کے بعد پکڑی تھیں۔ وہ لوگ بہت
تھے۔ صبح کے وقت جب سب لوگ لوٹنے لگے تو عبدل نے کہا، میں ابھی دیر
ں گا۔ تم لوگ چلو۔ عبدل نے اپنی مچھلیاں مہر کے لئے بھجوا دیں۔ یہ سب اسے دے دینا
بھی کوئی عجیب بات نہ تھی۔ جو کسی کو شک پڑتا۔ اور پھر وہ سب سے جدا ہو کے
کے اس حصے کی طرف چلا گیا، جہاں کہتے ہیں بڑے سے بڑے طوفان کے وقت
ریں ساکن رہتی ہیں۔ اور جس کے اندر مچھلیوں نے گھیرا باندھ کے کنول کا پھول
لھا ہے۔ ماہی گیر کبھی ادھر نہیں جاتے۔ نہ انھوں نے کبھی اس مقام کو دیکھا ہے
، اپنے بزرگوں سے سنا ہے کہ مغربی کنارے سے دو میل آگے بیچ سمندر میں

وہ مقام ہے جہاں ساکن سمندر کے اندر ایک خوف ناک بھنور ہے ،
جس کے اندر مچھلیاں اک کنول کا پھول نما دائرہ بنائے ہوئے گھومتی ہیں

عبدل چلا گیا ۔ وہ صبح کو واپس نہیں آیا ۔ وہ دوپہر کو بھی نہیں
شام کو اس کی لاش کنارے سے آ لگی اور گاؤں والوں نے اُسے اُ
اپنے قبرستان میں دفن کر دیا ۔

523